نقش بر سنگ

(کچھ خراجِ تحسین، کچھ خراجِ عقیدت)

سہیل انجم



نقش بر سنگ

(کچھ خراجِ تحسین، کچھ خراجِ عقیدت)

مصنف

سہیل انجم

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

NAQSH BAR SANG
by
SUHAIL ANJUM
Year of Edition 2021
ISBN: 978-93-91238-40-7
₹ 300/-

نام کتاب	:	نقش بر سنگ
مصنف	:	سہیل انجم
ناشر	:	سہیل انجم، A 370/6 ذاکر نگر، نئی دہلی۔
قیمت	:	۳۰۰ روپے
سنہ اشاعت	:	۲۰۲۱ء
صفحات	:	۲۲۴
تعداد اشاعت	:	۵۰۰
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔٦

رابطہ

سہیل انجم، 370/6A ذاکر نگر، نئی دہلی۔ 110025
M. 9818195929- 9582078862
sanjumdelhi@gmail.com

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
H.O. D1/16, Ansari Road, Darya Ganj, New Delhi-110002 (INDIA)
B.O. 3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 45678286, 45678204, 23216162
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

فہرست

☆ خراج عقیدت

OO

نقش برآب سے آگے

یہ بڑی عجیب و غریب روایت چل پڑی ہے کہ کسی کی صلاحیت و علمیت کا اعتراف اس کی زندگی میں نہیں کیا جاتا۔ کوئی کتنی ہی بڑی عبقری شخصیت ہو اس کی حیات میں اس کی خدمات کا اعتراف کم ہی ہوتا ہے۔ لیکن جوں ہی اس نے اپنی آنکھیں موندیں اس کی تعریف و ستائش میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے جاتے ہیں۔ بہت سے قلمکار اس انتظار میں رہتے ہیں کہ فلاں صاحب اس دنیا سے کوچ کریں تو ہم ان کے اوصاف بیان کریں۔ اسی طرح لوگ دوسروں سے اپنے تعلقات کا اظہار بھی ان کی موت کے بعد کرتے ہیں۔

میں ایک صحافی ہوں۔ میرا ذریعۂ معاش اور مشغلہ قلمکاری ہے۔ لیکن کوئی بھی قلمکار ہو وہ کچھ مضامین ذریعۂ معاش سے الگ ہٹ کر بھی لکھتا ہے۔ کبھی کسی شخصیت سے متاثر ہو کر تو کبھی کسی کی فرمائش پر۔ میں نے بھی متعدد شخصیات پر مضامین لکھے ہیں جن میں کچھ موجود ہیں تو کچھ مرحوم ہو چکے ہیں۔ کچھ لوگ تقاضا کر کر کے اپنے اوپر مضامین لکھواتے ہیں تو کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن کی موت مضمون لکھوا لیتی ہے۔

اس سے قبل 2015 میں میرے خاکہ نما مضامین کا ایک مجموعہ ''نقش برآب'' شائع ہوا تھا جس میں میں نے اپنے والد، دادا اور بڑے بھائی سمیت کئی اشخاص پر مضامین لکھے تھے۔ اسے قارئین نے بے حد پسند کیا تھا۔ وہ جلد ہی آؤٹ آف اسٹاک ہو گیا اور اس کا مطالبہ اب بھی جاری ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ تمام کے تمام مضامین

مرحومین پر تھے۔ ان میں سے کچھ ہمارے آبائی وطن سے تعلق رکھتے تھے تو کچھ دہلی سے۔

ان مضامین سے الگ ہٹ کر میں نے موجودین و مرحومین پر لکھے گئے اپنے دوسرے مضامین کا ایک انتخاب کیا ہے اور اس انتخاب میں بڑی بے دردی کے ساتھ بہت سے مضامین قلمزد کر دیے ہیں۔ یہ مضامین وقتاً فوقتاً لکھے گئے ہیں۔ کئی مضامین کئی سال پرانے ہیں تو کئی نئے ہیں۔ جو کسی لائق محسوس ہوئے ان کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں موجودین کو اور دوسرے میں مرحومین کو رکھا گیا ہے۔ یعنی کچھ خراج تحسین تو کچھ خراجِ عقیدت۔ چونکہ اس میں دونوں طرح کے لوگ شامل ہیں اس لیے میں نے اس مجموعے کا نام ''نقش بر آب'' سے ملتا جلتا ''نقش بر سنگ'' رکھا ہے۔ ان میں سے کچھ مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔

ممکن ہے کہ اس مجموعے کے چند ایک مضامین قارئین کو پسند آ جائیں۔ اگر ایک بھی مضمون کسی قاری کو پسند آ گیا تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت ضائع نہیں ہوئی۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ ان مضامین پر اپنی رائے ضرور دیں۔

شکریہ

سہیل انجم

پروفیسر ابن کنول
سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی

تبریک

سہیل انجم نے مجھے دو بار حیران کیا۔ ایک اس وقت جب مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر سلمان فیصل ان کے صاحبزادے ہیں۔ حیرانی کی وجہ یہ تھی کہ انھیں دیکھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے صاحبزادے اتنے بڑے ہوں گے۔ وہ تو خود ابھی نوجوانوں کی صف میں کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری بار اس وقت میں حیران و پریشان ہوا جب یہ معلوم ہوا کہ میری طرح مختصر اس شخص کی دو درجن کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ تو میں کئی دہائیوں سے جانتا تھا کہ وہ زود نویس صحافی ہیں۔ لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ ادیب بھی ہیں۔ ان کی کتابیں دیکھ کر علم ہوا کہ وہ محض صحافی نہیں بلکہ باضابطہ ادیب بھی ہیں۔ صحافی کے ہاتھ میں ہمہ وقت قلم رہتا ہے۔ کامیاب صحافی بھی وہی ہے جس کے اندر موضوع پر لکھنے کی صلاحیت ہو۔ اردو کے بیشتر نامور ادیب اخبارات و رسائل سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کی وابستگی کے سبب ان اخبارات اور رسائل کے معیار اور زبان و بیان میں انفرادیت نظر آتی ہے۔ سہیل انجم کو زبان و بیان پر بے پناہ قدرت حاصل ہے۔ انھوں نے تحریر و تقریر میں اپنی منفرد شناخت قائم کی ہے۔

سہیل انجم مختلف اخبارات سے وابستہ رہے۔ لیکن انھوں نے خود کو اور اپنے قلم کو کسی دائرے میں محدود نہیں ہونے دیا۔ انھوں نے ایک صحافی ہونے کا حق ادا کرتے

ہوئے عصری مسائل پر کالم لکھے، ادبا و شعراء کی ادبی خدمات پر تنقیدی مضامین بھی قلمبند کیے، سفرنامہ بھی تحریر کیا اور خاکہ نگاری کے میدان میں بھی اپنی شناخت قائم کی۔

''نقش بر سنگ'' سہیل انجم کے خاکوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ ''نقش بر آب'' عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ خاکہ نگاری انتہائی نازک صنف ادب ہے۔ خاکہ نگار کے قلم کی ذرا سی لغزش ممدوح کی شخصیت کو تباہ و برباد کرنے کی وجہ بن سکتی ہے۔ اس لیے خاکہ نگار کو نہ صرف خود محتاط رہنا پڑتا ہے بلکہ اپنے قلم پر بھی مضبوط گرفت رکھنی پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے بعض خاکہ نگار وفات کے بعد کسی شخصیت پر ''قلم درانوی'' کرتے ہیں۔ میں نے اپنے ایک انشائیے ''تعزیت مہر و وفا میرے بعد'' میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ سہیل انجم نے حوصلے سے کام لیتے ہوئے زیادہ تر باحیات لوگوں کے خاکے لکھے ہیں۔

''نقش بر سنگ'' میں ان کے کئی اسلوب نظر آتے ہیں۔ خراج تحسین کا انداز جدا ہے اور خراج عقیدت کے خاکوں کا طرز مختلف ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب قلمکار کو زبان اور اس کے اظہار پر قدرت حاصل ہو۔ سہیل انجم نے ان خاکوں میں ان شخصیات کو حیات جاوید بخش دی ہے جن پر خاکے لکھے ہیں۔ ''سہیل'' کے لغوی معنی ایک ایسے ستارے کے ہیں جس کی تاثیر سے چمڑے میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے اور حشرات الارض مر جاتے ہیں۔ بلا شبہ ان خاکوں کے سبب ممدوحین کی شخصیت میں خوشبو محسوس ہونے لگتی ہے۔ ان کے محاسن نمایاں ہوتے ہیں اور معائب مر جاتے ہیں۔

میں سہیل انجم کو اس کتاب کی اشاعت پر صمیم قلب سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کی تحریر کی تابندگی ہمیشہ قائم رہے گی۔

OO

شکیل رشید
ایڈیٹر روزنامہ، ممبئی، اُردو نیوز

مقدمہ

بات کچھ پرانی ہے۔ عروس البلاد ممبئی میں اُردو کتابوں کی تاریخی دکان مکتبہ جامعہ میں، جو شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور صحافیوں کے مل بیٹھنے کا ایک اڈہ بھی ہے، ایک روز ایک کتاب پر نظر پڑی۔ نام تھا ''میڈیا روپ اور بہروپ'' سہیل انجم کے مضامین کا مجموعہ...... سہیل انجم کا نام اَن سنا تو نہیں تھا مگر ان سے علیک سلیک نہیں تھی...... کتاب کے صفحات الٹ پلٹ کر دیکھے۔ مضامین کے عنوانات دل کو لگے۔ چونکہ میڈیا ہی میرا اوڑھنا بچھونا تھا (اور آج بھی ہے) اس لیے کتاب خرید لی۔ پڑھی اور سہیل انجم سے ہمیشہ کے لیے دوستی کرلی۔ گویا کہ یہ کتاب میرے اور مصنف کے درمیان رابطے کے لیے ایک پُل بن گئی۔ دوستی عرصے تک یکطرفہ ہی رہی۔ جب میرا روزنامہ ''اردو ٹائمز'' ممبئی میں آنا ہوا تب ان سے دعا سلام ہوئی۔ روزنامہ ''ممبئی اردو نیوز'' سے وابستہ ہونے کے بعد تعلقات مزید پختہ ہوگئے۔ بلکہ سچ کہیں تو تعلقات کی پختگی میں ان کی کتابوں نے ہی اہم کردار ادا کیا۔ بالخصوص دو کتابوں ''بازدیدِ حرم'' اور ''دینی رسائل کی صحافتی خدمات'' نے۔ اپنے اخبار اور محمد عارف اقبال کے پرچے ''اردو بک ریویو'' کے لیے میں نے ان دونوں ہی کتابوں کا مختصر تعارف و تبصرہ تحریر کیا تھا۔ ''بازدیدِ حرم'' جیسا کہ نام ہی سے ظاہر ہے سفرِ حج کی روداد ہے اور دوسری کتاب اردو زبان میں دینی اور مذہبی صحافت کی

ایک تاریخ ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد تحقیقی کام ہے۔ مجھے یہ دونوں ہی کتابیں اسلوب کے لحاظ سے بھی اور معلومات کے لحاظ سے بھی پسند آئیں۔ بلکہ اس قدر پسند آئیں کہ میں نے سہیل انجم کوفون کر کے مبارک باد بھی دی۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک کتاب نے سہیل انجم تک پہنچایا، ان سے یکطرفہ دوستی کروائی، پھر ان کی دوسری کتابیں رابطے کا ذریعہ بنیں اور آج بھی رابطے کا ذریعہ ہیں۔

سہیل انجم بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں۔ مشہور و معروف صحافی۔ عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ بلکہ اگر میں یہ کہوں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ جہاں جہاں اردو زبان کے اخبارات پڑھے جاتے ہیں، نیٹ پر ہی سہی، وہاں وہاں لوگ سہیل انجم کے نام سے واقف ہیں۔ ریڈیو وائس آف امریکہ واشنگٹن (اُردو سروس) کے سننے اور پڑھنے والوں کے لیے ان کا نام نا معلوم نہیں ہے۔ ملک اور بیرون ملک کے کئی اخباروں اور رسالوں میں ان کے کالم، تجزیے، تبصرے، خبریں اور معروف شخصیات سے لیے گئے انٹرویوز شائع ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن سہیل انجم صرف صحافی ہی نہیں ایک اچھے ادیب بھی ہیں۔ وہ جس موضوع پر بھی لکھتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ میں نے اوپر کی سطروں میں ان کی تین کتابوں کا تذکرہ کیا ہے جبکہ ان کی دو درجن کے قریب کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں اور مقبول بھی۔ مثلاً ''میڈیا روپ اور بہروپ'' ہی کی طرح میڈیا سے متعلق ان کی کتابیں ''میڈیا اردو اور جدید رجحانات''، ''اردو صحافت اور علماء''، ''مغربی میڈیا اور اسلام''، ''احوالِ صحافت''، ''دہلی کے ممتاز صحافی''، ''مولانا محمد عثمان فارقلیط: حیات وخدمات''، ''مولانا محمد عثمان فارقلیط کے منتخب اداریے'' اور ''دینی رسائل کی صحافتی خدمات''۔ کہنے کو تو یہ تمام ہی کتابیں میڈیا یا بالفاظ دیگر صحافت کے ہی موضوع پر ہیں لیکن سہیل انجم کے قلم کی روانی، جملوں کی سلاست اور ادائیگی اور اپنی بات کہنے کے لیے مناسب لفظوں کے انتخاب نے ان کی تحریروں کو ادبی رنگ دے دیا ہے۔ میڈیا کے موضوع سے ہٹ کر جو کتابیں ہیں ان میں ادبی رنگ مزید ابھر کر سامنے آتا ہے۔ مثال سفرِ حج کی کتاب کی لے لیں۔ اسے اس موضوع پر لکھی گئی دنیا کی بہترین کتابوں میں جگہ دی جا سکتی ہے۔

لیکن یہاں اس کتاب پر نہیں ان کی نئی کتاب ''نقش بر سنگ'' پر بات کرنی ہے۔

یہ سہیل انجم کے تحریر کردہ خاکوں کا دوسرا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ ''نقش بر آب'' کے نام سے 2015 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں بارہ مرحومین کے خاکے شامل تھے۔ ''نقش بر آب'' لوگوں کو چونکا گئی۔ خصوصاً ان ادیبوں کو، جو یہ طے کیے بیٹھے ہیں کہ ان سے بہتر نہ کوئی لکھنے والا ہے اور نہ ہوگا۔ وہ، جو سوائے اپنی تحریروں کے دوسروں کی تحریروں پر نظر تک نہیں ڈالتے اور صحافیوں کی تحریریں تو ان کی نظر میں ''خبروں'' کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی ہیں۔ اس مجموعے کے چار خاکے بہترین خاکوں کی فہرست میں جگہ پاسکتے ہیں۔ ایک خاکہ ان کے والد مرحوم مولانا حامد الانصاری انجم پر ہے جو نابغۂ روزگار تھے۔ ایک اچھے شاعر تو تھے ہی خطیب، طبیب، ادیب، صحافی اور سیاست داں بھی تھے۔ یقیناً سہیل انجم کی زندگی پر اپنے والد مرحوم کے کمالات کی چھاپ بھی پڑی ہوگی اور ان کی بہت ساری خوبیاں بھی اِن کے حصے میں آئی ہوں گی۔ یہ خاکہ ایک بیٹے کی اپنے مرحوم باپ کی یاد میں لکھی گئی ایک بہترین تحریر ہے۔ ایک خاکہ اپنے دادا پر، ایک مرحوم بڑے بھائی اور ایک خاکہ معروف صحافی محفوظ الرحمٰن پر ہے۔ یہ خاکے پر اثر بھی ہیں اور لاجواب بھی۔ سہیل انجم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ خاکہ نگاری کے فن سے نابلد ہیں اور مشہور فلم رائٹر جاوید صدیقی کے خاکوں کی کتاب ''روشن دان'' کے مطالعے نے انہیں خاکے لکھنے کی جانب مائل کیا۔ لیکن میرا یہ خیال ہے کہ اپنے پیاروں کی جو محبت ان کے دل میں بھری ہوئی تھی وہ اظہار کی راہ دیکھ رہی تھی اور خاکوں سے بہتر اظہار کا طریقہ کوئی اور کیا ہوسکتا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنے پیاروں اور عزیزوں کو یاد کرنے کے لیے قلم کاغذ سنبھالا اور تحریریں خاکوں میں ڈھلتی گئیں۔

خاکوں کا یہ نیا مجموعہ ''نقش بر سنگ'' 26 خاکوں پر مشتمل ہے۔ خاکوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ ''خراجِ تحسین'' کے تحت ہے۔ اس حصے میں تیرہ ''موجودین'' کے خاکے ہیں اور دوسرا حصہ ''خراجِ عقیدت'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں تیرہ ''مرحومین'' کے خاکے ہیں۔ سہیل انجم نے یہ مضامین مختلف کیفیات میں تحریر کیے ہیں۔ مثلاً کوئی

خاکہ یا خاکہ نما کسی کی شخصیت سے متاثر ہو کر لکھا۔ کوئی کسی کے تقاضے پر اور کچھ اس لیے کہ بقول ان کے" کچھ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن کی موت مضمون لکھوا لیتی ہے"۔ میں اوپر یہ ذکر کر آیا ہوں کہ سہیل انجم کا اسلوب مجھے اچھا لگا ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے دونوں ہی عنوانات کے تحت اپنے حقیقی اسلوب کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں ایسی تبدیلیاں بھی کی ہیں جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان خاکوں کو لکھنے والا ایک کہنہ مشق قلمکار اور صحافی ہے۔ مختلف طرز اور انداز میں لکھنا ایک صحافی کے لیے ہی ممکن ہے کیونکہ یہ اس کے پیشے اور فن کا بنیادی تقاضہ ہے۔ ان تحریروں کو پڑھنے والے مختلف کیفیات سے گزرتے ہیں۔ پہلے حصے میں جن شخصیات کے خاکے ہیں بلا شک وشبہ سب کی سب تحسین کی مستحق ہیں۔ جیسے کہ م افضل، مودود صدیقی، مولانا عزیز عمر سلفی، پروفیسر شہپر رسول وغیرہ۔ سہیل انجم نے ان کی تحسین تو کی ہے لیکن تحسین کو کہیں بھی چاپلوسی میں بدلنے نہیں دیا ہے جیسا کہ کچھ لوگ کرتے ہیں۔ ان شخصیات کے خاکے پڑھتے ہوئے جہاں ان کی شخصیت عیاں ہو کر سامنے آجاتی ہے وہیں ان کے کارنامے اور ان کی خدمات سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے۔ خاکہ نگار نے ان شخصیات کے بیان میں سادگی برتی ہے۔ نہ کسی کے تعلق سے آسمان پر چڑھانے والے الفاظ استعمال کیے ہیں اور نہ ہی کسی کی شخصیت کو گھٹا کر پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ م افضل پر لکھی تحریر کی یہ چند سطریں ملاحظہ کریں:

"افضل صاحب بعد میں سیاست داں اور سفارت کار بن گیے لیکن حقیقتاً وہ صحافی ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی صحافت سے ان کا رشتہ منقطع نہیں ہوا ہے۔ اب بھی وہ اخباروں کے لیے مضامین لکھتے ہیں"۔

ان سطروں میں سہیل انجم نے سچ کو سچ ہی کی طرح پیش کر دیا۔ بالکل سادہ انداز میں۔ مبالغہ آرائی سے بچتے ہوئے۔

دوسرے حصے میں مرحومین کے خاکے ہیں۔ ان خاکوں کا اسلوب اور انداز الگ ہے۔ یہ سب اپنے وقت کی اہم شخصیات تھیں۔ مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری،

مولانا عبدالوہاب خلجی، حفیظ نعمانی، ڈاکٹر حنیف ترین اور دیگر۔ ان خاکوں میں جانے والوں کے احترام کے ساتھ دنیا کی بے ثباتی کی کیفیت بھی شامل ہے۔ حنیف ترین کے خاکے کی یہ سطریں پڑھنے والوں کو یقیناً بے چین کر دیں گی:

''ہندوستان آنے کے بعد انہوں نے بہت کوشش کی کہ انہیں کل ہند سطح کے مشاعروں میں پڑھوایا جائے۔ وہ لال قلعہ کے مشاعرے میں بھی پڑھنے کے مشتاق تھے۔ لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ اگر انسان کو کسی کی موت کی تاریخ پیشگی معلوم ہو جائے تو وہ چاہے گا کہ اس کی وہ خواہشیں پوری کر دی جائیں جن کی تکمیل کے لیے وہ تڑپ رہا ہے۔ لیکن قدرت نے اس کا انتظام ہی نہیں کیا ہے''۔

سہیل انجم نے ان تحریروں کے بارے میں قارئین کی رائے مانگی ہے۔ میں ایک قاری کی حیثیت سے انہیں اس کتاب کے لیے مبارکباد دوں گا۔ اور یقین ہے کہ خاکوں کی اس بہترین کتاب کے لیے قارئین بھی انہیں مبارکباد پیش کریں گے۔

OO

خراجِ تحسین

م۔ افضل

صحافت، سیاست، سفارت

یہ ان دنوں کی بات ہے جب اردو صحافت کی وادیٔ پرخار میں قدم رکھنا آسان نہیں تھا۔ بہت جاں فشانی اور برسوں کی جگر کاوی کے بعد کوئی اس لائق بنتا تھا کہ وہ خود کو صحافی کہلوا سکے۔ لیاقت و قابلیت کی سب سے ہلکی سی شرط یہ تھی کہ ایک صحافی کو اردو پر عبور ہونا چاہیے اور کم از کم اتنی انگریزی تو آنی ہی چاہیے کہ وہ خبروں اور مضامین کا اردو میں ترجمہ کر سکے۔ جب 1980 میں دہلی سے روزنامہ قومی آواز کا اجرا ہوا اور اس کے ایڈیٹر جناب عشرت علی صدیقی نے ڈیسک پر کام کرنے کے لیے صحافیوں کا تقرر شروع کیا تو ایک روز ایک شخص کسی نوجوان کو لے کر پہنچے اور عشرت صاحب کو بتایا کہ یہ بہت تعلیم یافتہ ہیں۔ انھوں نے فلاں فلاں کورس کر رکھا ہے۔ یہ شاعر بھی ہیں۔ ان کو بطور صحافی رکھ لیجیے۔ تو عشرت صاحب نے کہا کہ مجھے اس سے غرض نہیں ہے کہ انھوں نے کون کون سا کورس کر رکھا ہے۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ یہ خبروں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر سکیں گے یا نہیں۔ (بروایت موہن چراغی)۔

ان دنوں روزنامہ صحافت کے ساتھ ساتھ ہفت روزہ صحافت کا بھی دور دورہ تھا۔ روزنامہ کے مانند ہفت روزہ اخباروں میں خبروں کا ترجمہ تو نہیں کرنا ہوتا تھا مگر مضامین، انٹرویوز اور رپورٹوں کا ترجمہ کرنا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ تجزیاتی مضامین بھی لکھنے ہوتے تھے اور پروف ریڈنگ بھی کرنی ہوتی تھی۔ اخبار کی سیٹنگ بھی کرانی ہوتی اور

مختلف اخبارات ورسائل سے تصاویر منتخب کر کے نکالنا بھی ہوتا تھا۔ ان دنوں اردو کی کوئی نیوز ایجنسی نہیں تھی۔ لہٰذا ایڈیٹر اور سب ایڈیٹر کی قابلیت وصلاحیت کے بل بوتے پر ہی اخبار کے صفحات کا پیٹ بھرا جاسکتا تھا۔

یہ 80 کی دہائی کی بات ہے۔ 1982 میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے اردو سے ایم اے کرنے کے بعد میں نے کچھ دنوں تک اپنے وطن لوہرسن بازار، ضلع سنت کبیر نگر، اتر پردیش میں بے روزگاری کے دن کاٹے۔ پھر میں کسی روزگار کی تلاش میں دہلی آیا مگر اس نے ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں مجھے دھتکار کر بھگا دیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر قسمت آزمائی کا خیال آیا اور میں ایک بار پھر دہلی آ گیا۔ اس بار اسے مجھ پر کچھ ترس آیا۔ 1983 سے 1985 تک میں دہلی میں مختلف قسم کے دفاتر میں کام کرتا رہا جو میرے طبعی میلان کے بالکل برعکس تھے۔ ان میں مکتبہ جامعہ نئی دہلی ہفت روزہ اخبار نو اور کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار جامع مسجد کی ملازمتیں قابل ذکر ہیں۔ مکتبہ جامعہ میں میری تنخواہ سوا تین سو روپے، اخبار نو میں ساڑھے تین سو روپے اور کتب خانہ انجمن میں چار سو روپے ماہانہ تھی۔ میں حساب میں بے حد کمزور واقع ہوا ہوں۔ لیکن مکتبہ جامعہ میں اکاؤنٹ سیکشن میں کام کرنا پڑا۔ بعض اوقات جامعہ میں اس وقت کے اسٹور کے پاس مکتبہ کی اسٹیشنری کی دکان اور اردو بازار جامع مسجد پر واقع اس کی کتابوں کی دکان پر بھی بیٹھنا پڑتا تھا۔ اخبار نو میں سرکولیشن میں کام کرنا پڑا۔ جہاں اخباروں کے بنڈل رکشے پر لاد کر پوسٹ آفس لے جا کر پوسٹ بھی کرنا ہوتا تھا۔ یہ کام میرے مزاج کے برعکس تھا۔ لہٰذا میں نے پندرہ دنوں میں ہی ملازمت ترک کر دی اور نصف تنخواہ لے کر نکل گیا۔ لیکن کتب خانہ انجمن میں مجھے اخبار نو کی وجہ سے ہی ملازمت ملی۔ کتب خانے کے مالک مولوی منشی نذیر صاحب سے نوکری مانگتے ہوئے میں نے بتایا کہ میں اخبار نو میں بھی کام کر چکا ہوں۔ یہ ایک طرح کی سفارش ثابت ہوئی۔ انھوں نے اظہار مسرت کرتے ہوئے ایک کاغذ پر مجھ سے اردو میں کچھ لکھوایا۔ میں نے ہاتھ سنبھال کر الفاظ بنا بنا کر لکھے تو وہ مطمئن ہو گئے اور انھوں نے ملازمت دے دی۔ لیکن وہ بھی میرے مزاج کے مطابق نہیں تھی۔ لہٰذا چند ماہ

کے بعد میں نے وہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ اس طرح 1985 میں پھر اپنے وطن کی جانب مراجعت ہوئی۔ وہاں سے دل بہلانے کے لیے میں ممبئی کے ہفت روزہ اخبار ''بلٹز'' اور دہلی کے ہفت روزہ ''اخبار نو'' کے لیے بلا معاوضہ رپورٹنگ کرنے لگا۔ میں نے اپنی پہلی رپورٹ جب اخبار نو کو بھیجی تو افضل صاحب کو میں نے ایک خط لکھا اور انھیں یاد دلایا کہ میں وہی ہوں جس نے آپ کے یہاں پندرہ دنوں تک ملازمت کی تھی۔ افضل صاحب کا بڑا پن کہ انھوں نے نہ صرف میری رپورٹ چھاپی بلکہ اس پر میرا نام بھی دیا اور اس کے ساتھ نمائندہ بستی بھی لکھا۔ بس پھر کیا تھا۔ میرے حوصلوں کو جیسے پر لگ گئے اور میں تقریباً ہر ہفتے رپورٹیں ارسال کرنے لگا۔ مالی یافت تو کچھ نہیں تھی نہ بلٹز سے اور نہ ہی اخبار نو سے لیکن یہ کام تسکین قلب کا سامان بن کر ضرور بن گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس علاقے میں لوگ مجھے ایک صحافی کے طور پر جاننے لگے۔

اسی اثنا میں ایک روز افضل صاحب کا خط ملتا ہے۔ انھوں نے دہلی آکر اپنے اخبار میں کام کرنے کی پیشکش کی تھی۔ میں نے جواباً لکھا کہ از راہ کرم مجھے ملازمت کی شرائط بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ تنخواہ کتنی ہوگی۔ انھوں نے جواب دیا کہ تنخواہ ساڑھے سات سو روپے ماہانہ ہوگی اور ہفتے میں پانچ دن کام کرنا ہوگا۔ مجھ جیسے بے روزگاری کی مار جھیل رہے شخص کے لیے یہ ایک پر کشش پیشکش محسوس ہوئی اور میں فروری 1987 میں دہلی وارد ہو گیا اور اخبار نو میں کام کرنے لگا۔ یہ عرض کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا کہ افضل صاحب کو یہ مشورہ ہمارے علاقے کے ایک معروف عالم دین، مسلم قائد اور ہمارے کرم فرما حضرت مولانا ادریس بستوی نے دیا تھا۔ یہاں کچھ دنوں تک کام کرنے سے اندازہ ہوا کہ میں جواب تک خود کو صحافت کا طرم خاں سمجھتا تھا بالکل صفر ہوں۔ مجھے تو کچھ آتا ہی نہیں۔ صحافت سیکھنے کے لیے برسوں کی کڑی محنت کی ضرورت ہے۔ اس وقت کی صحافت اور آج کی صحافت میں بہت فرق ہے۔ آج تو کمپیوٹر آنا چاہیے۔ آپ کو زبان آئے یا نہ آئے۔ انگریزی آئے یا نہ آئے۔ آپ ترجمہ کر سکیں یا نہ کر سکیں۔ آپ اچھی زبان لکھ سکیں یا نہ لکھ سکیں۔ آپ کو اصطلاحات کا علم ہو یا نہ ہو۔ فارسی سے کچھ شد بد ہو یا نہ ہو۔ بس آپ

کو خبریں کمپوز کرنا آتا ہو۔ دوسرے اخباروں اور ویب سائٹس سے مضامین کا سرقہ کرنا آتا ہو۔ آپ صفحہ سازی کر سکیں۔ بس اور کیا چاہیے۔ اگر آپ میں یہ سب خوبیاں ہیں تو آپ صحافی بن گئے۔

کچھ دنوں تک میں اخبار نو میں افضل صاحب سے ڈکٹیشن لے کر مضامین لکھتا رہا۔ مضمون لکھنے کے بعد ان کو دکھاتا۔ وہ مجھے سامنے بٹھا کر اس کو پڑھتے اور غلطیوں کی نشاندہی کرتے۔ میری تحریر میں اصلاح کرتے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا کہ ایک ایک دو دو پیراگراف بے دردی سے کاٹ دیا کرتے۔ پھر بتاتے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ کچھ دنوں کے بعد میں نے ترجمے کی مشق شروع کر دی۔ ابتدا میں بہت غلطیاں ہوتی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ تھوڑا بہت ترجمہ کرنے لگا۔ افضل صاحب پوری محنت کے ساتھ میری تربیت کرتے اور میں ایمانداری کے ساتھ ان کے بتائے ہوئے نکتوں کو اپنے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کرتا۔

پرانی دہلی اور نئی دہلی کے نقطہ اتصال پر واقع ترکمان گیٹ پر اخبار نو کا دفتر تھا جو بہت چھوٹا سا تھا۔ ایک کمرے پر مشتمل۔ اس میں افضل صاحب نے اپنے لیے ایک کیبن بنوا لیا تھا۔ کمرے کا فرش نیچا تھا اور نصف حصے میں دو چھتی ڈال دی گئی تھی جس پر کاتب حضرات بیٹھتے اور اخبار کی فائل اور دیگر ضروری کاغذات رکھے رہتے۔ لیکن دفتر جتنا تنگ تھا افضل صاحب، ان کے برادر نسبتی انیس درانی صاحب اور ان کے والد یعنی افضل صاحب کے سسر جناب محمد یوسف خاں درانی عرف ابو جی کے دل اتنے ہی بڑے تھے۔ اس وقت اخبار نو اپنی مقبولیت کے بام عروج پر تھا۔ جب بھی کوئی لیڈر یا اخبار نو کا کوئی پرستار یا قاری پہلی بار دفتر آتا تو یہ دیکھ کر دنگ رہ جاتا کہ اس چھوٹے سے دفتر سے اتنا بڑا اخبار نکل رہا ہے۔ لوگ پوچھ بیٹھتے کہ افضل صاحب یہاں سے آپ اخبار نکال رہے ہیں۔ اس چھوٹے سے اور تنگ سے کمرے سے۔ اس پر افضل صاحب مسکراتے ہوئے جواب دیتے کہ جی ہاں اسی کبوتر خانے سے تو اخبار نکال رہا ہوں۔

میں نے اخبار نو کے لیے فیلڈ اسٹوریز بھی کیں اور سیاست دانوں کے انٹرویوز

بھی کیے۔ وہ ایک ایسا پلیٹ فارم تھا کہ میں چاہتا تو اس سے بہت فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ کئی افراد نے فائدہ اٹھایا بھی۔ افضل صاحب چاہتے تھے کہ میں بھی آگے بڑھوں اور صحافت میں اپنا اور ان کا نام روشن کروں۔ (ان کا نام تو روشن تھا ہی)۔ وہ اکثر مجھ سے کہتے کہ ہفتے میں جو دو دن خالی رہتے ہیں ان دنوں میں روم پر سو کر مت گزاریے، باہر نکلیے۔ لوگوں سے ملیے جلیے۔ سیاست دانوں سے ملیے۔ ان سے روابط قائم کیجیے۔ جب بھی کسی سے اخبار نو کے حوالے سے ملیے تو ذاتی طور پر بھی اپنا تعارف کرائیے اور اس سے ذاتی مراسم پیدا کرنے کی کوشش کیجیے۔ لیکن اس وقت ان کی باتیں میری فہم سے بالاتر تھیں اور میں ان کے مشورے پر عمل کرنے سے خود کو معذور پاتا۔ وہ سیاست دانوں سے ملنے کے وقت بعض اوقات مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ وہ کسی سیاست داں سے انٹرویو کا وقت لیتے اور انٹرویو کے لیے مجھے بھیج دیا کرتے تھے تاکہ اس سیاست داں سے میرے بھی روابط ہو جائیں۔ اگر چہ میں ان کی اس کوشش پر کبھی کھرا نہیں اترا لیکن میں اس کا اعتراف کرنا چاہوں گا کہ اخبار نو کے پلیٹ فارم سے جس طرح سیاست دانوں یا ادبی شخصیات سے ملاقات ہوئی اس کے بعد اس طرح سے نہیں ہو سکی۔ اخبار نو نے مجھے ایک شناخت دی اور کم از کم میرے اپنے آبائی وطن میں میرا اور اخبار نو کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا تھا۔ یہاں دہلی میں بھی کم و بیش یہی صورت حال ہے۔ اب تک کے پینتیس سالہ صحافتی دور میں زیادہ سے زیادہ تین ساڑھے تین سال میں نے مستقل طور پر اخبار نو میں کام کیا تھا لیکن آج بھی بہت سے لوگ یہی پوچھتے ہیں کہ آپ اخبار نو میں ہیں نا۔ افضل صاحب صحافت میں میرے استاد ہیں اور اس پر مجھے فخر ہے۔

اخبار نو میں کام کرنے کے دوران بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ بہت سے صحافیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا اور بہت سے اچھے قلمکاروں کے ساتھ کام کرنے کے مواقع بھی ملے۔ جن میں لکھنؤ کے جناب شاہ فاروق عطا اور الٰہ آباد کے جناب سید مظہر حسین قابل ذکر ہیں۔ جن اہم شخصیات سے اخبار نو کے دفتر میں ملاقات ہوئی ان میں معروف ادیب اور صحافی جناب شمیم طارق بھی ہیں۔

افضل صاحب نے اردو صحافت میں ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی اور وہ نئی روایت تھی مختلف شہروں میں اپنے نمائندے مقرر کرنا اور ان کی رپورٹوں کے ساتھ ان کے نام بھی شائع کرنا۔ انھوں نے دوسرے ملکوں میں بھی نمائندے مقرر کیے تھے۔ خاص طور پر خلیج اور نیپال میں۔ نیپال میں نمائندگی کا قرعۂ فال میرے عزیز دوست زاہد آزاد جھنڈانگری کے نام نکلا تھا۔ انھیں بھی اخباروں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے پاکستان، لندن اور ماسکو میں بھی نمائندے مقرر کیے تھے۔ اخبار نو کے دورِ عروج میں ایسے بہت سے لوگ آئے جنھیں صحافت سے دلچسپی تھی اور جنھوں نے اپنے شوق کی تکمیل کے لیے یہ راہ اختیار کی تھی۔ اور پھر یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ اخبار نویسی ان تمام لوگوں کی، چند کو چھوڑ کر، زندگی کا ایک لازمی حصہ بن گئی۔ پھر تو کئی لوگوں نے اسے پیشے کے طور پر بھی اختیار کرلیا۔ میں بھی انھی لوگوں میں شامل ہوں جنھوں نے شوقیہ رپورٹنگ کا آغاز کیا اور پھر یہی میرا ذریعۂ معاش اور اوڑھنا بچھونا بن گئی۔

عہد حاضر کے ممتاز صحافی اور روزنامہ "جدید خبر" کے مالک و مدیر جناب معصوم مرادآبادی کی صحافت کی ابتدا بھی اخبار نو سے ہوئی تھی۔ اس بارے میں م۔ افضل صاحب بتاتے ہیں کہ جب میں نے اخبار نو شروع کیا تو معصوم صاحب غالب اکیڈمی میں کتابت اور خطاطی سیکھتے تھے۔ میں کسی پروگرام کے سلسلے میں غالب اکیڈمی جاتا تو وہ مجھ سے ملتے۔ ان کا خط بہت اچھا تھا۔ انھی دنوں مجھے اپنے اخبار کی سیٹنگ کے لیے ایک کاتب کی ضرورت پیش آئی۔ میں نے غالب اکیڈمی کے استاد اور ملک کے ممتاز خطاط جناب خلیق ٹونکی سے معصوم صاحب کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ وہ اسٹار پاکٹ بکس میں کام کرتے ہیں۔ میں نے ان کو بلوا کر اخبار نو کی سیٹنگ کا کام ان کو سونپ دیا۔ اس سلسلے میں میں ان کی مدد کرتا تھا۔ اسی دوران وہ کراچی گئے۔ وہاں سے واپسی پر انھوں نے ایک طویل مضمون لکھا جو کہ نوری نستعلیق پر تھا۔ انھوں نے بتایا کہ کمپیوٹر پر اردو کتابت شروع ہوئی ہے۔ یہ مضمون اسی کے بارے میں ہے۔ انھوں نے نوری نستعلیق کے بارے میں پوری تفصیل بیان کی تھی۔ میں نے اسے اخبار نو کے درمیانی صفحات پر

شائع کیا تھا۔ اس طرح ان کی صحافت کی ابتدا ہوئی۔

اسی اخبار میں گنج ڈنڈوارہ ضلع ایٹہ کا ایک نوجوان بھی آیا جسے افضل صاحب نے سرکولیشن میں کام کرنے کا موقع دیا۔ بعد میں انھوں نے اس نوجوان سے کہا کہ وہ اخبار کے لیے اشتہارات کا کام کرے۔ وہ جتنے اشتہار لائے گا اس پر اسے تنخواہ کے علاوہ پندرہ فیصد کمیشن ملے گا۔ اس نوجوان نے اشتہاروں کا کام شروع کر دیا۔ شدید محنت و مشقت کا ثمرہ ملا اور آج وہی نوجوان ''اسکائی ایڈورٹائزنگ اینڈ مارکیٹنگ'' کمپنی کا مالک ہے اور لوگ اسے شفیق الحسن کے نام سے جانتے ہیں۔

ان دنوں افضل صاحب لندن سے نکلنے والے ایک انتہائی معیاری اور خوبصورت ادبی و فلمی جریدے ''شفق'' کے لیے بھی کام کرتے تھے۔ بلکہ وہ ہندوستان میں شفق کے نمائندہ تھے۔ وہ اس جریدے کے لیے بعض اوقات مجھ سے بھی مضامین لکھواتے۔ مجھے یاد ہے کہ اکتوبر 1987 میں بالیووڈ کے پلے بیک سنگر کشور کمار کے انتقال پر انھوں نے مجھ سے ہی ان کی شخصیت پر ایک مضمون لکھوایا تھا۔

قدرت نے ان کے مزاج میں صحافتی خوبیاں کوٹ کوٹ کر بھر دی ہیں۔ اخبار نو کے زمانے میں وہ فیلڈ میں بھی جاتے تھے اور ایکسکلیوسیو اسٹوریز بھی کرتے تھے۔ اس وقت وہ ایک صحافی، ایک اخبار کے مالک اور مدیر، اخبار کے رپورٹر اور اس کے ایجنٹ بھی ہوا کرتے تھے۔ انھوں نے ابھی حال ہی میں ہندی کے معروف صحافی سنتوش بھارتیہ کو دیے گئے ایک طویل انٹرویو میں بتایا ہے کہ کس طرح وہ اپنے اسکوٹر سے میرٹھ اور مرادآباد تک اخبار کے بنڈل لے کر جاتے تھے اور راستے میں جتنے بھی اخباروں کے ایجنٹ ملتے ان کو اپنا اخبار دیتے۔ اشتہاروں کے لیے بڑی بڑی کمپنیوں میں بھی وہ خود ہی جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے اخبار نو کے لیے مارکیٹنگ کا بھی کام کیا۔ اخبار نو پرانی دہلی کے بے کے آفسیٹ پریس میں چھپتا تھا۔ جب اخبار کی کاپی تیار ہو جاتی تو افضل صاحب اسے پریس بھجوا دیتے لیکن پیچھے پیچھے خود بھی وہاں پہنچ جاتے اور اپنے سامنے اس کو چھپواتے تاکہ چھپائی میں کوئی خامی نہ رہے۔ کبھی کبھی تو ان کو پوری رات وہیں پریس ہی

میں گزار دینی پڑتی تھی۔

اخبار شروع کرنے کے کچھ دنوں بعد افضل صاحب نے ایک ماروتی کار خرید لی۔ ایک بار ان کو ایران کے دورے پر جانا تھا۔ اس وقت تک ان کے پاس کار نہیں تھی۔ انھوں نے ہم لوگوں سے کہا کہ میں چاہوں تو ابھی کار لے سکتا ہوں۔ لیکن ایران کے دورے سے واپسی پر خریدوں گا۔ پھر خود ہی ہنس کر کہنے لگے کہ حالانکہ لوگ یہی سوچیں گے کہ ایران سے خاصے پیسے ملے ہیں جس سے کار خریدی گئی ہے۔ ان کی کار کا رنگ ہرا تھا۔ ایک بار انڈین یونین مسلم لیگ کے لیڈر جناب غلام محمود بنات والا نے دیکھا کہ افضل صاحب کی کار کا رنگ ہرا ہے تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس پر افضل صاحب نے چٹکی لیتے ہوئے ان سے کہا کہ بنات والا صاحب میں نے ہرے رنگ کی کار اس لیے خریدی ہے تاکہ آپ جیسے لوگوں کو دھوکہ دے سکوں۔ بنات والا صاحب اس جملے پر بہت محظوظ ہوئے تھے۔

ان دنوں منگل کے روز اخبار کی کاپی فائنل ہوتی تھی اور عموماً ہر منگل کو رات میں گیارہ بج جایا کرتے تھے۔ میں، اخبار کو سیٹ کرنے والے خطاط ذکیر الدین صاحب اور کاتب حیدر علی صاحب جوگا بائی اوکھلا رہتے تھے۔ آخری بس رات میں گیارہ بجے دہلی گیٹ کے اسٹینڈ سے ملتی تھی۔ لیکن ایسا بہت کم ہوتا کہ ہم لوگ اسے پکڑ پاتے۔ افضل صاحب کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ اس لیے اگر کاپی وقت سے پہلے فائنل ہو جاتی تو ہم لوگ بس سے چلے جاتے۔ حالانکہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا۔ عموماً گیارہ کے بعد ہی کاپی فائنل ہو پاتی۔ افضل صاحب کی یہ اعلیٰ ظرفی تھی کہ وہ ہر منگل کو اپنی گاڑی سے ہم تینوں کو گھر تک چھوڑ کر جاتے۔ حالانکہ اگر وہ چاہتے تو آٹو کا کرایہ دے دیتے اور ہم لوگ اس سے گھر چلے جاتے۔ یا یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ تم لوگ جس طرح بھی چاہو جاؤ، میں نے تم لوگوں کے جانے کا ٹھیکہ تھوڑے ہی لے رکھا ہے۔ لیکن جب بھی وہ دہلی میں رہے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انھوں نے خود ہم لوگوں کو نہ چھوڑا ہو۔

اخبار نو کے ایڈیٹر کی حیثیت سے افضل صاحب کے، سیاست دانوں بالخصوص

مسلم سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ ملی قائدین سے بھی زبردست تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ ان دنوں کوئی ایسا بڑا مسلم قائد نہیں تھا جس سے ان کے گہرے مراسم نہ رہے ہوں۔ خاص طور پر شاہ بانو مقدمہ کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک اور اس کے بعد بابری مسجد تحریک کے دوران ملی قائدین سے ان کے روابط مسلسل قائم رہے۔ وہ مسلم ایشوز کو اپنے اخبار میں پوری طاقت کے ساتھ اٹھاتے اور مسلمانوں کے موقف کو بھرپور انداز میں پیش کرتے۔ جس کی وجہ سے ملی قائدین کے ساتھ ساتھ اردو قارئین میں بھی افضل صاحب کو ایک باوقار مقام حاصل ہو گیا تھا۔ ان پر مسلم رہنماؤں کو اس قدر اعتماد تھا کہ اہم ملی مسائل سے متعلق میٹنگوں میں وہ ان کو بھی مدعو کرتے اور ان کی باتوں کو کافی اہمیت دیتے۔ بیشتر قائدین اخبار نو کے دفتر آ کر ان سے صلاح ومشورہ بھی کرتے تھے۔

انھیں دنوں جبکہ بابری مسجد کی تحریک زوروں پر تھی، 30اپریل 1990 کو انڈیا گیٹ کے پاس بوٹ کلب پر بابری مسجد کے حق میں ایک تاریخی ریلی ہوئی تھی جس میں پورے ملک کی اعلیٰ مسلم قیادت شریک ہوئی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کا اتحاد قابل دید تھا۔ جن شخصیات کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی ان میں دہلی کی جامع مسجد کے امام مولانا سید عبداللہ بخاری، جناب سید شہاب الدین ایم پی، مسلم لیگ کے رہنما جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ، جناب غلام محمود بنات والا اور مولانا مظفر حسین کچھوچھوی قابل ذکر ہیں۔ مجھے یاد ہے اس ریلی میں افضل صاحب نے بھی تقریر کی تھی۔ اس وقت وہ ایک خوبرو نوجوان تھے اور اپنے ہم عمر صحافیوں میں سب سے زیادہ ایکٹو اور سرگرم تھے۔ جب وہ تقریر کرنے آئے تو ان کے گلے میں کیمرہ لٹکا ہوا تھا اور ہاتھ میں قلم اور ایک رائٹنگ پیڈ تھا۔ افضل صاحب نے جب کیمرے اور قلم کی قسم کھا کر اپنی تقریر کا آغاز کیا تو بھیڑ میں زبردست جوش پیدا ہو گیا۔ میں نے پہلی بار افضل صاحب کو تقریر کرتے ہوئے دیکھا اور سنا تھا۔

ان دنوں اخبار نو کا تقریباً ہر شمارہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔ اتر پردیش اور بہار میں تو اسے اردو صحافت کا برانڈ کہا جاتا تھا۔ ان دنوں جن شماروں نے دھوم مچائی تھی ان میں مسلم پرسنل لا بورڈ، بابری مسجد تحریک اور علیگڑھ میرٹھ ملیانہ وہاشم پورہ کے فسادات پر

خصوصی شمارے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ رسول نمبر، اردو نمبر، اظہر الدین نمبر، اندرا گاندھی کے قتل پر خصوصی شمارہ اور سرکردہ شیعہ رہنما مولانا کلب عابد پر خصوصی شمارے کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کسی موضوع کو بنیاد بنا کر نمبر نکالے جائیں تو قارئین انھیں پسند نہیں کرتے۔ لیکن اگر کسی شخصیت پر نمبر نکالا جائے تو وہ بہت پسند کیا جاتا ہے۔

افضل صاحب نے جیسا کہ وہ بتاتے ہیں، جناب شاہد صدیقی کے ہفت روزہ اخبار ''نئی دنیا'' سے صحافت کی ابتدا کی تھی۔ جہاں وہ مضمون نگاری اور رپورٹنگ کے علاوہ سیاست دانوں سے انٹرویوز بھی کیا کرتے تھے۔ ان کے متعدد انٹرویوز روزنامہ قومی آواز میں بھی شائع ہوئے تھے۔ لہٰذا متعدد سیاست دانوں سے ان کے دوستانہ مراسم انہی دنوں میں قائم ہو گئے جس سے ان کو بھی فائدہ پہنچا اور ان کے اخبار کو بھی۔ اسی دوران جبکہ اخبار نو اپنی مقبولیت کے بام عروج پر تھا، انھوں نے سیاست میں قدم رکھ دیا۔ قسمت نے یاوری کی اور 1990 میں انھیں جنتا دل نے راجیہ سبھا کا رکن بنا دیا۔ ان دنوں مجھے اس کا قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ پارلیمنٹ کا ممبر بننے کی کیا اہمیت ہے۔ لہٰذا انہی دنوں میں جبکہ ان کا نام راجیہ سبھا کے لیے چل رہا تھا میں نے گھریلو ضرورت کے پیش نظر ان سے وطن جانے کے لیے چھٹی مانگی۔ وہ ذرا زچ ہوئے اور کہنے لگے کہ ذرا رک جایئے۔ مجھے ایم پی بن جانے دیجیے۔ اس کے بعد چلے جایئے گا۔ ورنہ ان حالات میں اخبار کون دیکھے گا۔ خیر وہ ایم پی بن گئے۔ دفتر میں پھول ہار آئے اور ایم پی بننے کے بعد دفتر میں پہلی بار ان کی آمد پر ہم لوگوں نے ہار پہنا کر ان کا استقبال کیا۔ اس کے بعد وہ سیاست میں سرگرم ہو گئے۔

ان کے ایم پی بننے کی خبر انگریزی اور ہندی کے صحافیوں کے لیے ایک بریکنگ نیوز ثابت ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی طرح لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ افضل صاحب نے جامع مسجد کے مشہور ہوٹل ''کریم'' میں ملازمت کی ہے۔ لوگوں نے ہوٹل میں ملازمت کا مطلب یہ نکالا کہ وہ وہاں ''بیرے'' تھے۔ حالانکہ وہ وہاں منیجر کے فرائض

انجام دے رہے تھے۔ لیکن اس خبر نے ان کے ایم پی بننے کے واقعہ کو چار چاند لگا دیے۔ پھر کیا تھا انگریزی اور ہندی اخباروں اور جریدوں میں ان پر کالم لکھے جانے لگے۔ مجھے یاد ہے کہ بیشتر نے اپنے مضمون کی سرخی لگائی تھی ''زیرو سے ہیرو''۔ انھوں نے اس پر روشنی ڈالی کہ کس طرح اپنی ذاتی محنت و کاوش کی بنیاد پر ہوٹل میں کام کرنے والے ایک شخص کو ایم پی شپ حاصل ہوگئی۔

افضل صاحب نے ایم پی بننے کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے تمام اسٹاف کو گیس کا کنکشن دے دیا۔ حالانکہ ان دنوں گیس کا کنکشن بلیک میں بکتا تھا اور ایم پی حضرات اس سے خوب فائدہ اٹھاتے تھے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے اسٹاف کو بلکہ قومی آواز کے ایڈیٹر موہن چراغی صاحب کی فرمائش پر قومی آواز کے تمام اسٹاف کو بھی، جس جس کے پاس گیس کنکشن نہیں تھا، کنکشن دے دیا۔

کچھ دنوں کے بعد میں نے اخبار نو کی ملازمت ترک کر دی۔ اس کی وجہ یہ رہی کہ میں اپنی فیملی دہلی لے آیا تھا اور انہی دنوں جناب احمد مصطفیٰ صدیقی راہی کے بیٹے جناب سہیل صدیقی نے ''ہمارا قدم'' نام سے ایک بہت اچھا ہفت روزہ شروع کیا تھا۔ انھوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا اور اخبار نو کے پندرہ سو روپے کے مقابلے میں ڈھائی ہزار کی پیشکش کی۔ میں نے ہمارا قدم جوائن کر لیا۔ اس وقت سیاسی مصروفیات کی وجہ سے افضل صاحب کی اخبار سے دلچسپی ذرا کم ہوگئی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ ان ایشوز پر روشنی ڈالتے تھے جن پر مضامین لکھے جانے ہوتے۔

ادھر جب افضل صاحب کو ساؤتھ ایوینیو میں سرکاری رہائش گاہ ملی تو انھوں نے اخبار نو کا دفتر وہاں منتقل کر دیا۔ اس دوران ان سے بہت کم ملاقاتیں رہیں۔ البتہ ساؤتھ ایوینیو میں ان کے دفتر میں میری مسلسل آمد و رفت رہی۔ اس وقت اخبار نو میں جناب عتیق مظفر پوری، جناب جاوید قمر اور جناب حقانی القاسمی بھی کام کرتے تھے۔ جناب مودود صدیقی صاحب جو اب تک اخبار نو کے منیجر تھے اب افضل صاحب کے پی اے بھی ہو گئے۔ انھوں نے بیک وقت دو محاذ سنبھال لیے۔ ایک اخبار کا اور دوسرا افضل صاحب

کی سکریٹری شپ کا۔ 1996 میں افضل صاحب کی راجیہ سبھا کی مدت مکمل ہوگئی۔ انھیں اپنی سرکاری رہائش گاہ خالی کرنی پڑی۔ ان کا دفتر وہاں سے اٹھ کر کوچہ چیلان آ گیا۔ بعد میں وہ پٹودی ہاؤس دریا گنج میں واقع ان کے گھر کے گراؤنڈ فلور پر منتقل ہو گیا۔ اتفاق دیکھیے کہ افضل صاحب کی ایم شپ ختم ہونے کے بعد پھر ان سے ملاقاتیں ہونے لگیں اور میں نے اخبار نو میں جز وقتی کام شروع کر دیا جو کافی دنوں تک جاری رہا۔ لیکن افضل صاحب نے کبھی یہ شکوہ نہیں کیا کہ تم نے میرا اخبار کیوں چھوڑ دیا تھا۔ اخبار نو جوائن کرنے کے وقت ان کی جو شفقت و محبت میرے ساتھ رہی وہی بعد میں بھی قائم رہی۔ یہاں تک کہ اب بھی اس کا سلسلہ جاری ہے۔

صرف اتنا ہی نہیں کہ انھوں نے میری کوتاہیوں کو نظر انداز کیا بلکہ بعد میں جب میں روزنامہ قومی آواز میں پارٹ ٹائم کام کرنے لگا اور ریڈیو وائس آف امریکہ واشنگٹن کی اُردو سروس کی جانب سے ہندوستان میں نمائندے مقرر کیے جانے لگے اور ان کے ایک دوست اور وی او کے سینئر براڈ کاسٹر جناب رضی احمد رضوی نے ان سے دہلی میں نمائندگی کرنے کے لیے کسی صحافی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے میرے نام کی سفارش کی۔ میں نے بھی فوراً وی او اے کے لیے رپورٹنگ شروع کر دی۔ یہ واقعہ میری صحافتی اور خانگی زندگی کے لیے نیک فال ثابت ہوا۔ قابل ذکر ہے کہ اس سے قبل افضل صاحب ہی وائس آف امریکہ کے لیے نمائندگی کرتے رہے ہیں۔

اسی دوران م۔ افضل صاحب کو اردو اخباروں کے مدیروں کی سب سے بڑی تنظیم ''آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس'' کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ انھوں نے بحیثیت صدر متعدد کارنامے انجام دیے، جن میں اردو ایڈیٹرس کی دو روزہ کل ہند کانفرنس کا انعقاد بھی شامل ہے۔ وہ کانفرنس 30-29 جولائی 1999 کو پارلیمنٹ کے انیکسی ہال میں منعقد ہوئی تھی اور اس کا افتتاح اس وقت کے صدر جمہوریہ جناب کے آر نارائنن نے کیا تھا۔ خیال رہے کہ وہ اب تک کی پہلی اور آخری اردو ایڈیٹرس کانفرنس ہے جس کا افتتاح صدر نے کیا۔ اس سے قبل نومبر 1973 میں لکھنؤ میں آل انڈیا اردو کانفرنس کا انعقاد ہوا تھا جس

میں اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی تھی۔ اس میں ملک کے معروف صحافی مولانا محمد عثمان فارقلیط نے خطبۂ صدارت پیش کیا تھا۔

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے دوران جناب مودود صدیقی کی مرتب کردہ اُردو اخباروں کی پہلی اور آخری ڈائرکٹری کا اجرا بھی کے آر نارائن کے ہاتھوں عمل میں آیا تھا۔ یہ کانفرنس اردو صحافت کی تاریخ میں ایک بڑا کارنامہ تھی۔ اس میں پورے ملک سے سیکڑوں اخباروں کے مدیروں نے شرکت کی تھی۔ اس کے علاوہ سابق وزیر اعظم آئی کے گجرال، دیوے گوڑا، فاروق عبد اللہ، عارف محمد خاں، لالو پرساد یادو، غلام نبی آزاد، شیلا دیکشت اور اس وقت کے وزیر اطلاعات ونشریات پرمود مہاجن سمیت متعدد سیاست دانوں نے بھی شرکت کی تھی۔ کانگریس صدر سونیا گاندھی نے مندوبین کو عشایئے پر مدعو کیا تھا اور اس وقت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے چائے پر مدعو کیا تھا۔ حالانکہ وہ چائے کیا تھی پورا کھانا تھا۔ وہ اردو کی ایسی پہلی کانفرنس تھی جس کا افتتاح کسی صدر جمہوریہ نے کیا۔ دہلی میں ویسی اردو ایڈیٹرس کانفرنس پھر دوبارہ منعقد نہیں ہو سکی۔

م۔ افضل صاحب کو 2004 میں دہلی حکومت نے دہلی اُردو اکادمی کا وائس چیئرمین مقرر کر دیا۔ لیکن ان کو صرف ڈیڑھ سال ہی کام کرنے کا موقع ملا۔ کیونکہ جولائی ۲۰۰۵ء میں اس وقت کے وزیر اعظم ڈاکٹر من موہن سنگھ نے انھیں سفیر مقرر کیا اور سفارتی خدمات انجام دینے کے لیے انھیں انگولہ بھیج دیا۔ دراصل اس سے قبل سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال نے انھیں یمن کا سفیر مقرر کیا تھا۔ لیکن اسی دوران ان کی حکومت ختم ہو جانے کی وجہ سے انھوں نے یمن جانے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ جب اٹل بہاری واجپئی کی قیادت میں این ڈی اے کی حکومت قائم ہوئی تو ان سے کہا گیا کہ وہ اگر چاہیں تو یمن میں بحیثیت سفیر اپنا عہدہ سنبھال سکتے ہیں لیکن انھوں نے اخلاقی بنیاد پر اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ کم مدت تک وائس چیئرمین رہنے کے باوجود انھوں نے اردو اکادمی میں کئی اچھے اور قابل ذکر کام کیے۔ مثال کے طور پر انھوں نے دہلی کی تمام سرکاری بسوں پر اردو میں بھی اعلان لکھوایا اور دوسرے تمام سڑکوں اور اور عمارتوں

کے سائن بورڈ پر بھی ان کے نام اردو میں لکھوائے گئے تھے۔ میری معلومات کے مطابق انھوں نے بحیثیت چیئر پرسن اکادمی کی گاڑی کا استعمال کبھی نہیں کیا۔

بہر حال انگولہ کے بعد انھیں گیبون اور ترکمانستان کا بھی سفیر مقرر کیا گیا۔ یاد رہے کہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں کسی اردو صحافی کو پہلی بار سفیر بنایا گیا تھا۔ انھوں نے 2010 تک یعنی پانچ سال تک سفارت کاری کی۔ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ افضل صاحب نے اپنا اخبار ''اخبارنو'' ترکمان گیٹ دہلی سے شروع کیا اور بعد میں ان کو ترکمانستان کا سفیر بنایا گیا۔ گویا ان کے کریئر کا ایک پڑاؤ ''ترکمان گیٹ سے ترکمانستان تک'' بھی ہے۔

سفارت کاری کے فرائض انجام دینے کے بعد جب وہ 2010 میں ہندوستان واپس آئے تو راقم الحروف نے ان سے ایک طویل انٹرویو کیا جو اس وقت متعدد اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ یہ کوئی مبالغہ آرائی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ انھوں نے انگولہ اور بالخصوص ترکمانستان میں تاریخ ساز کارنامے انجام دیے۔ گیارہ دسمبر 2010 کو ہندوستان پاکستان، افغانستان اور ترکمانستان کے مابین گیس پائپ لائن معاہدہ ہوا جو ہندوستان کی گیس کی ضرورت کا پندرہ فیصد پورا کرتا ہے۔ اس معاہدے سے آنے والی کئی نسلیں فائدہ اٹھائیں گی۔ اس معاہدے پر اشک آباد میں ترکمانستان، افغانستان اور پاکستان کے صدور اور ہندوستان کے اس وقت کے پیٹرولیم وزیر مرلی دیورا نے دستخط کیے تھے۔

ان کی سفارتی کامیابیوں کے ریکارڈ میں صرف یہی ایک واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے بہت سے قابل ذکر واقعات بھی ہیں۔ ان کے دور میں دونوں ملکوں کے مابین بہت اچھی تجارتی پیش رفت ہوئی۔ معاشی ڈپلومیسی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اب ان دونوں ملکوں کے رشتے صرف واجبی نہیں رہے بلکہ بہت گہرے ہو گئے ہیں اور ان میں زبردست گرمجوشی آ گئی ہے۔ گزشتہ بیس برسوں میں ترکمانستان کے لیے ہندوستانی وفود کے تیس اہم دورے ہوئے ہیں اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان کے دور میں یعنی صرف تین سال میں دس گیارہ دورے ہوئے تھے۔ جن میں دو وی وی آئی پی دورے بھی شامل ہیں۔ (صدر، نائب صدر اور وزیر اعظم کے دورے وی وی آئی پی دورے کہلاتے ہیں)۔

جناب حامد انصاری نے نائب صدر کی حیثیت سے پہلا دورہ ترکمانستان ہی کا کیا تھا جہاں انھوں نے تیل اور گیس سے متعلق ایک MOU یعنی قرارداد مفاہمت پر دستخط کیے تھے۔ وہیں سے دونوں ملکوں کے مابین ایسے معاہدوں کا آغاز ہوا۔ انہی کے دور میں ترکمانستان کے صدر گوربان گلی بردی محمدوف کا دورۂ ہند ہوا۔ جس میں چھ اہم معاہدوں پر دستخط ہوئے تھے۔

م۔ افضل کو ان کی کامیابیوں کے طفیل میں صرف ہندوستان کے سرکاری و سفارتی حلقوں ہی میں قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ خود ترکمانستان میں بھی انھیں بے پناہ عزت و وقار حاصل ہوا۔ وہاں کے صدر ان کے کاموں سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ وہ سرکاری تقریبات میں ان کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ افضل صاحب کے بقول ترکمانستان کے ٹیلی ویژن پر ان کے اتنے انٹرویوز ہوتے تھے کہ پورے دارالحکومت میں لوگ ان کو آسانی سے پہچاننے لگے۔ یہ شناخت یہیں تک نہیں رکی بلکہ ان کی مقبولیت میں اس حد تک اضافہ ہوا کہ وہاں کی پارلیمنٹ کی خاتون اسپیکر نے م۔ افضل کی الوداعیہ تقریب میں انھیں Son of Turkmenistan یعنی ''ترکمانستان کا سپوت'' ہونے کا خطاب دے دیا۔ آج دونوں ملکوں کے باہمی رشتے جن اونچائیوں پر ہیں پہلے وہاں کبھی نہیں رہے اور اس کا سہرا جناب م۔ افضل کے سر جاتا ہے۔

دراصل م۔ افضل کی سفارتی کامیابیوں کا سلسلہ انگولہ سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ یہاں یہ ذکر کرتے چلیں کہ انگولہ میں ان کو تین ملکوں کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ دوسرے دو ملک گیبون اور ریپبلک آف کانگو تھے۔ ان کے وہاں جانے سے قبل انگولہ سے بھی ہندوستان کے رشتوں میں گرم جوشی نہیں تھی۔ لیکن ان کی کوششوں سے انگولہ سے بھی ہندوستان کے رشتے بہت اچھے ہوئے۔ باہمی تعلقات کی استواری میں انھوں نے قابل ذکر رول انجام دیا۔ انگولہ میں ریفائنری کے شعبے میں ہندوستان کو 33 فیصد اشتراک کی پیشکش کی گئی۔ دونوں ملکوں کے مابین اہم وفود کے تبادلے ہوئے۔ انھوں نے وہاں تیل کے شعبے میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کے نتیجے میں آج ہندوستان انگولہ سے

کروڑوں ڈالر کا تیل خرید رہا ہے۔ ایک ملاقات میں خود اس وقت کے وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے انہیں ''آئیل ایکسپرٹ ایمبیسڈر'' قرار دیا تھا۔

م۔ افضل سے جب بات ہو تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اردو کی بات نہ ہو۔ اُردو زبان سے ان کا گہرا ناطہ ہے اور ممبر پارلیمنٹ کی حیثیت سے انھوں نے اردو زبان اور اُردو اخبارات کے تعلق سے پارلیمنٹ میں جتنے سوال پوچھے تھے اتنے آج تک کسی بھی ایم پی نے نہیں پوچھے۔ یہ ایک ریکارڈ ہے۔ لہٰذا جب راقم الحروف نے ان سے پوچھا کہ وہ ساڑھے پانچ سال تک ملک سے باہر رہے اس درمیان اردو مدیروں کی سب سے بڑی تنظیم آل انڈیا اُردو ایڈیٹرس کانفرنس تقریباً Defunct ہو کر رہ گئی تھی تو انھوں نے کانفرنس کی صدارت کسی اور کو کیوں نہیں سونپ دی؟ انھوں نے بتایا کہ وہ اس کے لیے تیار تھے اور انھوں نے آزاد ہند کے ایڈیٹر جناب احمد سعید ملیح آبادی کو اس کی پیشکش کی تھی کہ وہ صدر کا عہدہ سنبھال لیں تا کہ اردو ایڈیٹرس کانفرنس اپنا کام کرتی رہے لیکن انھوں نے کسی مجبوری کے سبب معذوری ظاہر کی۔ بہر حال وہ آج بھی اس تنظیم کے صدر ہیں۔

موجودہ اردو اخباروں کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ آج ایک بار پھر اردو اخباروں کے حقوق کی لڑائی لڑنے کی ضرورت ہے۔ آج اُردو اخبارات فور کلر میں شائع ہو رہے ہیں اور نئی ٹکنالوجی کا بھرپور استعمال کر رہے ہیں۔ میں اس سلسلے میں اخباروں کے مالکوں اور مدیروں کے جذبے کو سلام کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اندر سے ان کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ بہت سے اخبارات بند بھی ہو گئے ہیں۔ ان کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے تا کہ یہ اخبار اور بہتر انداز میں نکلیں اور ان کا معیار اور بلند ہو اور ان کی سرکولیشن میں بھی اضافہ ہو۔ آج اُردو اخباروں کی ریڈرشپ بڑھانے کی ضرورت ہے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان کے پاس وسائل ہوں اور انھیں کھل کر کام کرنے کا موقع ملے۔

افضل صاحب بعد میں سیاست داں اور سفارت کار بن گئے لیکن حقیقتاً وہ صحافی ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی صحافت سے ان کا رشتہ منقطع نہیں ہوا ہے۔ اب بھی وہ

اخباروں کے لیے مضامین لکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ بحیثیت صحافی اردو زبان اور صحافت کی جو خدمت کر سکتے تھے وہ بحیثیت سیاست داں نہیں کر سکے۔ اسی لیے وہ اب بھی کالم تحریر کر کے اپنے خیالات قارئین تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔
(سفارتی ذمہ داریوں سے سبک دوشی کے بعد م۔ افضل کی سیاسی گرمیوں کو بوجوہ شامل نہیں کیا گیا ہے)

نومبر 2020

OO

ڈاکٹر شاہد پرویز

ایک اچھے انسان ایک اچھے صحافی

ڈاکٹر شاہد پرویز کی شخصیت کے تین نمایاں پہلو ہیں۔ ایک اچھا انسان، ایک اچھا صحافی اور ایک اچھا ایڈمنسٹریٹر۔ صحافت اور ایڈمنسٹریشن سے تو اب ان کا عملی رشتہ نہیں رہ گیا۔ تاہم اگر کوئی شخص ایک بار صحافت کی وادی میں قدم رکھ دے تو پھر وہ اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے قویٰ اتنے مضمحل اور حواس اتنے غیر معتدل ہو گئے ہوں کہ اسے خود پر قابو نہ رہ گیا ہو۔ چونکہ شاہد پرویز ان ناہمواریوں کی گرفت میں نہیں آئے ہیں لہٰذا وہ اب بھی کبھی کبھار کچھ نہ کچھ لکھ کر اخبار نویسی کی اپنی پیاس بجھاتے رہتے ہیں۔ البتہ ایڈمنسٹریٹر اب اس لیے نہیں رہ گئے کہ وہ ستمبر 2019 میں مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی حیدرآباد کے نئی دہلی کے ریجنل ڈائرکٹر کے منصب سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ لیکن وہ ایک اچھے انسان اب بھی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی یہ صفت ہمیشہ ان کی شخصیت کا لازمی اور نمایاں حصہ بنی رہے گی۔ کیونکہ اچھائی اور شرافت نہ تو کسی سے مستعار لی جاتی ہے اور نہ ہی وقتی و عارضی ہوتی ہے۔ ایک اچھا انسان ہمیشہ ایک اچھا انسان رہتا ہے۔ یہ خوبی وہ اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور اسے تاعمر عزیز رکھتا ہے۔ لہٰذا مجھے شاہد پرویز سے یہ توقع ہے کہ وہ اپنی اس پونجی کی تازندگی حفاظت کریں گے۔

یہ غالباً 1992 کی بات ہے۔ اسلامی ڈائجسٹ ہدیٰ، نئی دہلی کے مالک و مدیر مولانا احمد مصطفیٰ صدیقی راہی کے فرزند اور ہفت روزہ نئی دنیا کے مالک و مدیر جناب شاہد

صدیقی کے بھتیجے جناب سہیل صدیقی کا انتہائی خوبصورت ہفت روزہ ''ہمارا قدم'' کچھ دنوں تک اپنی تابانیاں بکھیر کر دم توڑ چکا تھا۔ اس کے بند ہونے کی وجہ سے میں بے روزگار ہو گیا تھا۔ ادھر مین پاور کی ایجنسی چلانے والے مسلم اکثریتی علاقہ اوکھلا گاؤں کے نورنگر علاقے میں رہائش پذیر جناب پرویز ہاشمی کو اپنے ہفت روزہ ''انٹرنیشنل جریدہ ٹائمز'' کے لیے ایک اچھے سب ایڈیٹر کی ضرورت تھی جو بوقت ضرورت بحیثیت ایڈیٹر انچارج بھی خدمات انجام دے سکے۔ اوکھلا موڑ اور ہولی فیملی ہاسپٹل کے درمیان میں واقع جولینا بازار کے بھارت گیسٹ ہاوس میں ان کا دفتر تھا اور وہیں ایک دوسری عمارت میں اخبار کا دفتر واقع تھا۔ میں چونکہ اس اخبار سے جز وقتی طور پر پہلے بھی وابستہ رہا ہوں اس لیے وہ مجھ سے واقف تھے۔ جب وہ اخبار فائل کاپی کے طور پر نکلتا رہا ہے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ پولیٹیکل سائنس میں استاد ڈاکٹر محمد صدیق اس کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ ایڈیٹر ہونے کی وجہ سے کوئی بھی ان کا نام نہیں لیتا تھا۔ سب ان کو چیف صاحب کہتے تھے۔ مولانا عبدالمنان عرف علامہ اس کی کتابت کیا کرتے تھے۔ میں اس کی ادارتی ذمہ داریاں نبھا رہا تھا۔ اس طرح مجھے کچھ تھوڑی بہت اضافی آمدنی ہو جاتی تھی۔ یعنی یہی کوئی سات سو روپے مہینہ۔ پہلے اس کا ایک عارضی دفتر بٹلہ ہاؤس کی پہلی گلی میں ہوا کرتا تھا۔ بعد میں کچھ دنوں تک اسے پرویز ہاشمی کے گھر سے تیار کیا جانے لگا۔

ان دنوں پرویز ہاشمی صاحب کی سیاسی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں اور جنتا دل کے رہنماؤں سے ان کے اچھے مراسم قائم ہو گئے تھے۔ بعد میں وہ دہلی اسمبلی کے رکن اور دہلی حکومت میں وزیر بھی ہوئے۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد کانگریس نے انھیں راجیہ سبھا کا رکن بنا دیا تھا۔ اسی دوران یعنی سیاست میں ترقیاتی منازل طے کرنے سے قبل انھوں نے اپنے دوستوں کے مشورے سے اخبار کو باضابطہ طور پر نکالنے کا فیصلہ کیا۔ لہٰذا اس اخبار کے شعبۂ ادارت میں کام کرنے والے ان کے دوست محمد وسیم نے مجھ سے ملاقات کی اور ان کی خواہش بیان کی۔ مجھے بھی ملازمت کی ضرورت تھی لہٰذا میں نے جریدہ ٹائمز جوائن کر لیا۔ اسی دوران بابری مسجد کی شہادت کا دلدوز سانحہ پیش آیا اور شمال مشرقی دہلی کی مسلم

کالونی ویلکم میں فساد ہوگیا۔ کرفیو کے خاتمے کے بعد ہم لوگوں کی ایک ٹیم نے ویلکم کا دورہ کیا اور متاثرین و فساد زدگان سے ملاقات کی اور ایک بھرپور رپورٹ بنائی جو صفحہ اول اور درمیانی صفحات پر شائع ہوئی۔ بہر حال ہم لوگ جی توڑ محنت کرتے رہے اور اخبار کی سرکولیشن بڑھتی رہی۔ بعد ازاں سیاسی کامیابیوں کے بعد اخبار سے پرویز ہاشمی کی دلچسپی کم ہوتی چلی گئی اور بالآخر آگے چل کر اخبار بند ہوگیا۔

اسی دوران ان کے دوستوں میں یہ طے پایا کہ ان کے حلقے سے جو لوگ بھی مضمون لکھ سکتے ہوں وہ لکھیں تاکہ اخبار میں تنوع پیدا ہو۔ وسیم صاحب کی فرمائش پر جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ قمر آغا نے بھی مضامین لکھنے شروع کر دیے۔ لیکن ان کے حلقے کے بہت سے لوگوں کا اصرار تھا کہ جناب شاہد پرویز بھی مضمون لکھا کریں خواہ ہر شمارے میں ایک ہی کیوں نہ ہو۔ وہ روزنامہ قومی آواز سے وابستہ تھے۔ اس وقت تک میں ان سے ذاتی طور پر واقف نہیں تھا۔ البتہ غائبانہ طور پر انھیں جانتا تھا۔ وہ پرویز ہاشمی کے قریبی دوستوں میں شامل رہے ہیں۔ بہر حال انھوں نے بھی مضمون لکھنا شروع کر دیا۔ ایک بار مجھے یہ کہا گیا کہ بٹلہ ہاؤس کی پہلی گلی میں شاہد پرویز رہتے ہیں۔ صبح کو دفتر آتے وقت تم ان سے مضمون لیتے آنا۔ اس وقت میں ذاکر نگر کی گلی نمبر چھ میں کرائے کے مکان میں فیملی کے ساتھ رہ رہا تھا۔ میں نے اگلی صبح کو ان کے دروازے پر دستک دی۔ ایک خاتون نکل کر آئیں۔ میں نے غرض و غایت بتائی۔ خاتون بڑی شفقت سے پیش آئیں۔ انھوں نے میرا نام پوچھا اور یہ بھی معلوم کیا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شاہد صاحب کی اہلیہ تھیں۔ اسی طرح دو ایک بار اور دروازے ہی پر ان سے ملاقات ہوئی۔ ان کے مشفقانہ برتاؤ اور ان کی خوش اخلاقی نے مجھے بہت متاثر کیا۔ دو تین ملاقاتوں کے بعد انھوں نے کہا کہ کبھی بچوں کو بھی لے کر آیئے۔ بہر حال ان کے اصرار پر میں ایک روز اہلیہ کے ساتھ ان کے گھر گیا۔ پھر تو آمد و رفت شروع ہوگئی۔ شاہد صاحب کی اہلیہ نے میری اہلیہ کے ساتھ بھی انتہائی محبت آمیز سلوک کا مظاہرہ کیا جو آج بھی باقی ہے۔ گویا میں شاہد صاحب سے بعد میں متاثر ہوا ان کی اہلیہ سے پہلے ہوا۔

یہاں میں یہ ذکر بھی کرتا چلوں کہ جریدہ ٹائمز کے زمانے میں شاہد پرویز سے میری بہت کم ملاقاتیں رہیں۔ دوایک بار اخبار کے دفتر میں اور شاید دوایک بار ان کے گھر پر۔

اسی دوران جریدہ ٹائمز کی سرکولیشن کم ہونے لگی اور مجھے ہلکا ہلکا احساس ہونے لگا کہ شاید یہ اخبار اب زیادہ دنوں تک اپنی آب و تاب برقرار نہ رکھ سکے۔ لہٰذا ایک سال کے اندر ہی میں نے محفوظ پناہ گاہ کی تلاش شروع کر دی۔ ہفت روزہ نئی دنیا کا جادو اس وقت بھی سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اس اخبار میں کام کر کے بہت سے صحافیوں نے صحافت کی دنیا میں نام پیدا کیا۔ اس کے مالک و مدیر جناب شاہد صدیقی اپنے وقت کے جید صحافی مولانا عبدالوحید صدیقی کے فرزند ہیں۔ مولانا عبدالوحید صدیقی نے جولائی 1951 میں روزنامہ نئی دنیا جاری کیا تھا جو بعد میں ہفت روزہ ہو گیا۔ نئی دنیا کے ادارتی عملے میں مولانا عبدالباقی اور ناز انصاری جیسے صحافی بھی شامل رہے ہیں۔ بعد میں اختر صدیقی اور پروانہ ردولوی بھی اس سے منسلک ہو گئے۔ اس نے ابتدا ہی میں اپنی شعلہ بار تحریروں سے کافی ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ یہ اخبار لاگ لپیٹ سے کام نہیں لیتا تھا اور کوئی بھی مسئلہ ہو جرأت مندی اور بے باکی کے ساتھ اٹھاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اخبار ہمیشہ حکومت کے نشانے پر رہا۔ اخبار اور مولانا عبدالوحید صدیقی پر مقدمات کی بھر مار کر دی گئی۔ مولانا کو بارہا جیلوں میں ڈالا گیا۔ یہاں تک کہ پیرانہ سالی میں بھی انھیں سلاخوں کے پیچھے دھکیلا گیا۔ لیکن اس کے باوجود ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی اور ان کا قلم کبھی بھی کمزور نہیں پڑا۔ وہ ملک و ملت کے مسائل کو بیباکی سے اٹھاتے رہے اور ناانصافیوں اور چیرہ دستیوں کو بے نقاب کرتے رہے۔ شاہد صدیقی نے اپنے والد کی روایت کو آگے بڑھایا اور اس اخبار کو ترقیوں کی نئی منزلوں سے ہمکنار کیا۔ انھیں چونکہ صحافت اور حق گوئی و بیباکی اپنے والد سے ورثے میں ملی ہے اس لیے انھوں نے بھی ہمیشہ جرأت مندی کے ساتھ صحافت کی۔ اخبار نئی دنیا ہمیشہ کمزوروں اور مظلوموں کا ہمدرد و غمگسار بنا رہا اور ان کے جائز حقوق کی آواز بلند کرتا رہا۔ جس کی وجہ سے شاہد صاحب کو بھی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ وہ بذات خود ایک بڑے صحافی ہیں۔ ملکی و بین الاقوامی سیاست پر ان کی

گہری نظر ہے۔ ایشوز کو اخبار میں کیسے اٹھایا جائے یہ فن انھیں خوب آتا ہے۔

شروع سے ہی میری خواہش نئی دنیا میں کام کرنے کی رہی ہے۔ لہٰذا ایک روز میں نے بغیر اطلاع کے جریدہ ٹائمز چھوڑ دیا اور سیدھے نئی دنیا کے دفتر پہنچ گیا۔ شاہد صدیقی صاحب سے میں نے ملازمت طلب کی۔ انھوں نے کہا کہ اب جبکہ تم گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہو چلو میرے اخبار میں بھی کام کرو۔ یہ ان کا بڑا پن تھا کہ انھوں نے بغیر کسی سوال جواب کے مجھے ملازمت دے دی اور میں نے وہاں کام کرنا شروع کر دیا۔ لیکن کچھ ذاتی وجوہات سے میں وہاں زیادہ دن ٹھہر نہیں سکا اور نہ ہی شاہد صاحب سے کچھ زیادہ فیضیاب ہو سکا۔ بہر حال ایک سال کام کرنے کے بعد میں نے نئی دنیا کو بھی خیر باد کہہ دیا۔

جریدہ ٹائمز چھوڑنے کے میرے فیصلے سے ظاہر ہے پرویز ہاشمی وغیرہ کو کافی تکلیف پہنچی اور انھوں نے اخبار کے عملہ کے سامنے اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کیا۔ لیکن جب بہت دنوں کے بعد ان سے میرا آمنا سامنا ہوا تو انھوں نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کیا اور خفگی کا اظہار کرنے کے بجائے میری خیریت پوچھی۔ میں ان کے اس برتاؤ سے بہت متاثر ہوا۔ اس واقعہ کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جب میں نے جریدہ ٹائمز چھوڑا تو میرے اوپر دفتر کے آٹھ سو روپے قرض تھے۔ اس وقت آٹھ سو روپے میرے لیے بہت اہمیت رکھتے تھے۔ میں نے کچھ دنوں کے بعد اخبار کے ایک کارکن کو یہ کہتے ہوئے پیسے لوٹا دیے کہ یہ پرویز صاحب کو دے دیجیے گا۔ لیکن چونکہ وہ صاحب اندر اندر مجھ سے پرخاش رکھتے تھے اس لیے میرا خیال ہے، ممکن ہے یہ غلط بھی ہو، کہ انھوں نے وہ پیسے پرویز صاحب کو نہیں دیے ہوں گے۔

اسی دوران یعنی 1994 کے اواخر میں جناب راشد شاذ نے ''ملی ٹائمز'' نامی ایک اردو ہفت روزہ شروع کیا جس کا دفتر ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی میں بنایا گیا۔ میں کسی کے توسط سے وہاں پہنچا اور پھر انھوں نے چار ہزار روپے تنخواہ پر مجھے رکھ لیا۔ ایک طرح سے میں اس اخبار کا ایڈیٹر انچارج تھا۔ ادھر شاہد پرویز سے میری ملاقاتوں کا

سلسلہ بند ہو گیا۔ اسی اثنا میں ایک دن روزنامہ قومی آواز کے کاتب اور ہمارے دوست جناب عبدالکریم نے، جو اس وقت ملی ٹائمز سیٹ کیا کرتے تھے، مجھ سے پوچھا کہ تم نے کبھی روزنامہ اخبار میں کام کیا ہے۔ میں نے نفی میں جواب دیا اور یہ بھی کہا کہ میں روزنامہ اخبار میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے قومی آواز کے ایڈیٹر جناب موہن چراغی سے اس بارے میں بات کی۔ عبدالکریم نے مجھ سے بتایا بھی مگر بات آئی گئی ہو گئی۔ پندرہ روز کے بعد انھوں نے کہا کہ ارے بھائی چراغی صاحب پوچھ رہے تھے کہ تمھارے دوست جو اخبار میں کام کرنا چاہتے تھے کہاں ہیں ان کو لاؤ۔ میں نے جا کر ان سے ملاقات کی۔ انھوں نے کہا کیا چاہتے ہو۔ میں نے کہا کہ یہاں کام کرنا اور سیکھنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ میں تمھیں سکھاؤں گا لیکن ایک شرط پر۔ اور شرط یہ ہوگی کہ تم بعد میں مجھ سے نوکری نہیں مانگو گے۔ میں نے ان کی شرط مان لی۔ انھوں نے مجھے سب سے پہلا کام رومن میں لکھا ہوا اخبار کا اداریہ اردو میں منتقل کرنے کو دیا۔

اداریہ اس وقت لکھنؤ سے مشین کے ذریعے آتا تھا۔ وہاں کا ایڈیشن نکل رہا تھا اور اداریہ عثمان غنی صاحب لکھا کرتے تھے۔ میں نے اس کو اردو میں منتقل کرنا شروع کیا۔ اس کے علاوہ چھوٹی اور آسان خبروں کا ترجمہ بھی کرنے لگا۔ یو این آئی اور پی ٹی آئی سے مشین پر انگریزی میں خبریں آتی تھیں۔ یہ راز بہت بعد میں کھلا کہ موہن چراغی نے مجھے فوراً جگہ کیوں دے دی تھی۔ دراصل رومن اداریہ کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے کوئی تیار نہیں تھا۔ اس وقت تک شعبۂ ادارت کے ایک اہم رکن جناب خلیق اعظمی یہ کام کیا کرتے تھے۔ کسی بات پر ان کی چراغی صاحب سے ان بن ہو گئی اور انھوں نے اداریہ منتقل کرنے کا کام بند کر دیا۔ انھوں نے چراغی صاحب سے کہا کہ دیکھتا ہوں اداریہ کون لکھتا ہے۔ جو لکھے گا اسے بھی دیکھوں گا اور تمھیں بھی۔ خلیق صاحب سے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں میری سلام دعا تھی۔ لہٰذا جب میں نے اس تنازع سے بے خبر، اداریہ کا ترجمہ کرنا شروع کیا تو وہ خاموش رہے، انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ بہت بعد میں مجھے اس کا علم ہوا۔ میں شام کے وقت قومی آواز پہنچتا اور جب تک اخبار کی کاپی جڑ نہ جاتی کام کرتا۔ تین چار ماہ

تک میں نے مفت میں کام کیا۔ مقصد صرف سیکھنا تھا۔ تین چار ماہ کے بعد چراغی صاحب نے ایک روز کہا کہ اب میں تمھیں کچھ معاوضہ دینا چاہتا ہوں۔ انھوں نے چھ سو روپے ماہانہ دینا شروع کیا۔ اس طرح قومی آواز سے میری تھوڑی بہت آمدنی ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ اس رقم میں اضافہ ہوتا گیا اور بالآخر بعد میں انھوں نے مجھے تقرر نامہ دے دیا۔ لیکن مستقل کئی سال کے بعد کیا۔ قومی آواز میں میرا آخری تقرر تھا۔ اس کے بعد کسی کا نہیں ہوا۔

البتہ قومی آواز میں جانے کے بعد میں رفتہ رفتہ شاہد پرویز صاحب سے قریب ہوتا گیا۔ اس وقت وہ قومی آواز کے علاوہ جدہ، سعودی عرب سے شائع ہونے والے پہلے اور اب تک کے آخری اردو روزنامہ "اردو نیوز" کے لیے بھی رپورٹنگ کرتے تھے۔ ان کو ایک معاون کی ضرورت تھی۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ اگر تم میرے لیے کچھ خبریں بنا دیا کرو تو میں تمھیں کچھ معاوضہ دیا کروں گا۔ ان کی یہ پیشکش میرے لیے بہت اہم تھی۔ اس وقت میں صبح کے وقت ملی ٹائمز جاتا اور پھر شام کے چار پانچ بجے قومی آواز کے لیے روانہ ہو جاتا۔ درمیان میں بھی کچھ کام کر لیتا۔ یعنی صبح نو دس بجے گھر سے نکلتا اور رات میں دس گیارہ بجے تک گھر پہنچتا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کچھ اضافی آمدنی ہو جائے گی ان کی پیشکش قبول کر لی۔

اب سلسلہ یوں شروع ہوا کہ میں قومی آواز کا کچھ کام کرنے کے بعد وہیں اسی دفتر میں اردو نیوز کے لیے بھی خبریں نقل کرنے لگا۔ نقل سے مراد یہ ہے کہ شاہد صاحب کچھ منتخب خبریں مجھے دے دیتے اور میں کاغذ پر انھیں اتار دیتا۔ اس کے لیے وہ مجھے اپنے کمرے میں جو کہ قومی آواز کا بیورو تھا بلا لیتے۔ اس وقت اس کمرے میں شاہد صاحب کے علاوہ چیف رپورٹر نصرت ظہیر، رپورٹر چندر بھان خیال اور ایک اور رپورٹر ظفر الدین بیٹھتے تھے۔ قومی آواز کے ایڈیٹر موہن چراغی ایک اچھے صحافی اور بلا کا نیوز سینس رکھنے والے شاہد صاحب کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے اور ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ جدہ کے اخبار کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ لیکن انھوں نے کبھی اس

پر اعتراض نہیں کیا۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ شاہد صاحب کو یہ کہتے ہوئے کوئی خبر تھما دیتے کہ یہ جدہ کے اخبار کے لیے مناسب رہے گی۔ شاہد صاحب کبھی اپنے روم میں تو کبھی سب ایڈیٹرس کی ڈیسک پر آکر اردو نیوز کے لیے خبریں بنایا کرتے۔ اس وقت تک مجھے اس کا شعور نہیں تھا کہ اپنے دفتر میں بیٹھ کر کسی دوسرے دفتر کا کام نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی قومی آواز میں چلنے والی اندرونی سیاست کا کوئی علم تھا۔ وہاں کی سیاست کی وجہ سے ہی شعبۂ رپورٹنگ سے وابستہ ایک صاحب کبھی کبھار اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے اور شاہد صاحب کے لیے کام کرنے کی وجہ سے مجھے بھی سخت سست کہہ دیتے۔ شاہد صاحب ان کی بعض عادتوں کی وجہ سے انھیں پسند نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا دونوں میں کوئی بہت اچھے تعلقات کبھی نہیں رہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے کسی موقع پر جب شاہد صاحب سامنے آجاتے تو وہ خاموش ہو جاتے۔ البتہ شاہد صاحب کبھی ان کی سطح پر نہیں اترے اور نہ ہی ان کی طرح عامیانہ باتیں کیں۔

حقیقت یہ ہے کہ قومی آواز میں شاہد پرویز کو سب سے زیادہ عزت حاصل تھی۔ چراغی صاحب بھی ان کا بڑا لحاظ کرتے اور دوسرے کارکن بھی۔ چراغی صاحب نے ایک بار ایک واقعہ بیان کیا کہ وہ شاہد صاحب کے ساتھ پریس کلب گئے ہوئے تھے۔ وہاں ان کے کسی دوست نے جب ان کے ساتھ شاہد صاحب کو دیکھا تو ان سے کہا کہ اچھا آپ اپنے سبارڈی نیٹ (ماتحت) کو بھی اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ چراغی صاحب اس پر بہت ناراض ہوئے اور کہا کہ خبردار آئندہ کبھی انھیں میرا سبارڈی نیٹ مت کہنا۔ یہ میرے ماتحت نہیں بلکہ میرے ساتھی ہیں۔ اسی طرح شاہد صاحب بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ قومی آواز کے کئی لوگ چراغی صاحب پر مسلم دشمن ہونے اور جانے کیسے کیسے الزامات لگاتے لیکن میں نے کبھی بھی شاہد صاحب کو چراغی صاحب کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ نہ سامنے نہ غیاب میں۔ شاہد صاحب کے بعد چراغی صاحب شفٹ انچارج اور معروف شاعر و ادیب فرحت احساس اور چیف سب ایڈیٹر جناب سید اجمل حسین کی عزت کرتے تھے۔ میں نے ان لوگوں کی زبان سے بھی ان کے

بارے میں کبھی کوئی ہلکی بات نہیں سنی۔ جبکہ دوسرے کئی کارکن چراغی صاحب سے لڑائی جھگڑا کر لیتے اور انھیں برا بھلا کہتے اور دھمکیاں بھی دیتے۔ سلام کلام بند ہو جاتا۔ مگر چراغی صاحب کی پیش قدمی کے بعد پھر مراسم بحال ہو جاتے۔ یہ بھی عام طور پر ہوتا کہ چراغی صاحب کسی سیاست داں کے انٹرویو کے لیے وقت لیتے تو اپنے ساتھ شاہد صاحب کو بھی لے جاتے۔ یہ ذکر بھی مناسب ہوگا کہ اردو نیوز جدہ کے لیے ہندوستان سے کھیل کی خبریں سید اجمل حسین بنایا کرتے تھے۔ اس دوران کلدیپ نیر اور ڈاکٹر بصیر احمد کے ہفتہ واری کالم بھی اردو نیوز میں شائع ہو رہے تھے۔ تمام خبریں اور مضامین شاہد صاحب کے گھر سے بذریعہ فیکس بھیجے جاتے۔

ادھر ہفت روزہ ملی ٹائمز بند ہو گیا اور میں ایک بار پھر بے روزگار اور اپنی تنخواہ کے ایک بڑے حصے سے محروم ہو گیا۔ میں م۔ افضل صاحب کے ہفت روزہ اخبار نو میں جز وقتی کام کرنے لگا۔ اسی درمیان قومی آواز کے شعبۂ ادارت سے وابستہ جناب اشہر ہاشمی نے مجھے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں جناب مسعود ہاشمی سے ملاقات کروائی۔ اس وقت اشہر ہاشمی اور کئی صحافی وہاں کیزوول کام کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی کمنٹری کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا کام دیا۔ وہ کام مہینے میں چھ روز ملتا تھا۔ ایک ترجمہ کے ڈیڑھ سو روپے ملتے تھے۔ اس طرح نو سو روپے مہینہ کی اضافی یافت شروع ہو گئی۔ ادھر شاہد صاحب نے میرا کام بڑھا دیا اور معاوضہ بھی۔ رفتہ رفتہ قومی آواز میں میری ذمہ داریاں بڑھنے کی وجہ سے وہاں شاہد صاحب کا کام کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لہٰذا میں رات میں دس گیارہ بجے گھر پہنچنے سے قبل شاہد صاحب کے گھر جاتا اور وہاں ان خبروں کو نقل کرتا۔ انھوں نے پھر میرا کام بڑھایا اور معاوضہ بھی۔ یعنی اب صبح کے وقت نکلنے سے پہلے میں کم از کم تین چار ایکسکلیوسیو خبریں بناتا اور انھیں شاہد صاحب کے گھر دیتے ہوئے اخبار نو یا قومی آواز چلا جاتا۔ اس طرح روزانہ دو بار ان کے گھر میرا آنا جانا ہو گیا۔ قومی آواز سے بھی ہم لوگ ساتھ آتے۔ روزانہ ان کے گھر جانے والوں میں میں تنہا نہیں تھا۔ ذاکر نگر میں رہنے والے قومی آواز کے سب ایڈیٹر جناب انور یوسف یعنی

اے وائی اعظمی بھی دفتر جاتے وقت ان کے گھر تھوڑی دیر رکتے۔ خلیق صاحب بھی، جو کہ اپنے والدین اور بھائیوں کے ساتھ ابوالفضل انکلیو میں رہتے تھے، ان کے گھر عام طور پر جایا کرتے۔ کام کی وجہ سے کم البتہ آمد و رفت کی وجہ سے ان کے گھر کے افراد سے میری قربت ہو گئی۔ شاہد پرویز جہاں شاہد صاحب سے شاہد بھائی ہو گئے وہیں ان کی اہلیہ بھابھی ہو گئیں۔ ان کے بیٹے شانی اور بیٹی سمیرہ بھی قدرے بے تکلف ہو گئے۔

اسی اثنا میں اردو نیوز میں ان کا کالم بھی شائع ہونے لگا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم بھی لکھا کرو۔ میں نے بھی لکھنا شروع کر دیا۔ اس طرح ایک ہفتے ان کا کالم چھپتا اور دوسرے ہفتے میرا۔ اس طرح کئی سال تک میں ان کے توسط سے بالواسطہ طور پر اُردو نیوز سے وابستہ رہا اور میرے متعدد کالم اس میں شائع ہوئے۔ لیکن وائس آف امریکہ میں مصروفیت بڑھ جانے کی وجہ سے میں نے ان سے معذرت کر لی۔ اس کے بعد قومی آواز کے سب ایڈیٹر، بہت اچھے صحافی، ادیب، شاعر اور بہت اچھے انسان جناب ظفر عدیم وہ کام کرنے لگے اور انھوں نے تا عمر یہ ذمہ داری نبھائی۔ 16 نومبر 2013 کو ان کا انتقال ہو گیا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ عام طور پر کام کے دوران کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی بات پر لوگوں کے درمیان بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن شاہد صاحب اور میرے درمیان کبھی کوئی بدمزگی نہیں ہوئی۔ میں نے کبھی یہ نہیں سنا کہ انھوں نے میرے تعلق سے کسی سے کوئی ایسی بات کہی ہو جو مجھے ناگوار گزرے۔ میں نے بھی کوشش کی کہ ان کے تعلق سے کوئی عامیانہ بات نہ کہوں۔

شاہد صاحب میں ایک اور خوبی ہے۔ وہ بڑے بذلہ سنج ہیں۔ فقرہ بازی میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ قومی آواز میں جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو جاتے تو کاتبوں میں جا کر بیٹھ جاتے اور پھر ہنسی مذاق اور قہقہوں کا دور شروع ہو جاتا۔ چراغی صاحب بھی وہیں آجاتے اور کچھ سب ایڈیٹرس بھی۔ سچ بات یہ ہے کہ قومی آواز کا ہر کارکن سوائے ایک کے جس کا ذکر اوپر اشارتاً ہوا ہے، شاہد صاحب کی عزت کرتا۔ وہ بھی کسی کے بارے میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے جس سے اس کو تکلیف پہنچے۔ اگر کسی سے مذاق

بھی کرتے تو انداز تضحیک آمیز نہیں ہوتا۔ اسی کے ساتھ وہ بڑے خوددار واقع ہوئے ہیں۔ اگر ان کی کوئی بات کسی کو ناگوار گزر جاتی تو پھر وہ اس سے بہت محتاط رہتے۔ وہ بھی لوگوں کی عزت کرتے۔ اب بھی قومی آواز کے کارکنوں کے بارے میں پوچھتے رہتے ہیں۔ وہ سب سے زیادہ سب ایڈیٹر مولانا رحمت اللہ فاروقی کو چھیڑتے۔ لیکن ان کے غیاب میں یہ بھی کہتے کہ اگر کسی کو جنتی شخص دیکھنا ہو تو مولانا کو دیکھ لے۔ مولانا فاروقی واقعتاً انتہائی شریف النفس آدمی ہیں۔ اردو، فارسی اور بڑی حد تک انگریزی پر بھی گرفت رکھتے ہیں۔ اُردو سے ان کو عشق سا ہے۔ دفتر کے بعض افراد ان کی شرافت نفسی سے ناجائز فائدہ بھی اٹھا لیتے۔

شاہد صاحب نے 1982 سے 1990 تک سب ایڈیٹر کی حیثیت سے، 1990 سے 1996 تک نمائندہ خصوصی کی حیثیت سے اور پھر 1996 سے 2000 تک بیورو چیف کی حیثیت سے قومی آواز میں خدمات انجام دیں۔ سچ بات یہ ہے کہ انھوں نے اپنی انفرادیت، اپنے کام، اپنی صحافتی اصول پسندی، اپنی خوش اخلاقی اور اپنی صلاحیتوں سے قومی آواز پر بہت گہری چھاپ چھوڑی اور اب بھی جبکہ ان کو قومی آواز چھوڑے 21 سال ہو گئے ہیں انھیں قومی آواز کے حوالے سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔ (خیال رہے کہ قومی آواز 2008 میں بند ہو گیا)۔ قومی آواز کے صحافی کی حیثیت سے انھوں نے متعدد اہم اور بڑی کانفرنسوں کی رپورٹنگ کی اور بڑے بڑے سیاست دانوں کے انٹرویوز کیے۔ وہ 1986 سے 1992 تک آل انڈیا ریڈیو نئی دہلی میں کیزوول نیوز ریڈر رہے۔ اس دوران وہ وہاں ٹرانسلیشن کا بھی کام کرتے رہے۔ جبکہ انھوں نے دوردرشن پر سماجی، سیاسی اور تعلیمی موضوعات پر مختلف ڈبیٹس میں حصہ بھی لیا۔

سیاست دانوں کے انٹرویوز پر مبنی ان کی کتاب ''آف دی ریکارڈ'' 2002 میں شائع ہوئی جسے بڑی پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ اسے آئیڈیا کمیونی کیشن نے شائع کیا تھا۔ اس کا اجرا ''انجمن ترقی اردو ہند'' راوز ایونیو، نئی دہلی کے دفتر میں ہوا تھا اور اجرا کی رسم کلدیپ نیر نے انجام دی تھی۔ آف دی ریکارڈ میں حالانکہ صرف سولہ سیاستدانوں کے

انٹرویوز ہیں لیکن یہ 1985 سے 2000 تک کے عرصہ پر محیط ہیں۔اس دوران انھوں نے جانے کتنے سیاستدانوں اور لیڈروں کے انٹریوز کیے ہوں گے لیکن ان لاتعداد انٹرویوز میں سے انھوں نے ایک خوبصورت انتخاب کیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس کتاب میں پانچ سابق وزرائے اعظم وی پی سنگھ، چندر شیکھر، نرسمہا راؤ، دیوے گوڑا اور آئی کے گجرال کے انٹرویوز بھی شامل ہیں۔جس وقت یہ کتاب شائع ہوئی تھی یہ پانچوں وزرائے اعظم حیات تھے۔ اب صرف دیوے گوڑا حیات ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ موہن چراغی نے لکھا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں 1980 میں دہلی سے قومی آواز کی اشاعت سے اپنی بات شروع کی ہے اور قومی آواز کی صحافت کے غیر جانبدارانہ اصولوں سے گزرتے ہوئے شاہد پرویز کی صحافیانہ صلاحیتوں اور اپنے اصولوں سے سمجھوتہ نہ کرنے کی ان کی خوبیوں تک پر اظہار خیال کیا ہے۔

اس وقت اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا:

”زیر نظر کتاب میں پندرہ برسوں میں کیے جانے والے انٹرویوز کا انتخاب شامل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ صرف انٹرویوز کا مجموعہ نہیں بلکہ پندرہ برسوں کی قومی و بین الاقوامی سیاسی سرگرمیوں کی ایک تاریخ ہے تو شاید غلط نہیں ہوگا۔ اس میں شامل انٹرویوز میں سے بعض قومی آواز کے لیے کیے گئے ہیں اور بعض روز نامہ اردو نیوز جدہ کے لیے۔ سارے کے سارے انٹرویوز پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔وی پی سنگھ کا انٹرویو کشمیر کے مسئلہ کی گرہیں کھولتا ہے تو سیتا رام کیسری کا انٹرویو تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ نرسمہا راؤ نے بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی تردید کی کہ بابری مسجد کے انہدام میں ان کا ہاتھ تھا تو چندر شیکھر نے موجودہ سیاست کے خد و خال پر روشنی ڈالی۔ پانچ وزرائے اعظم کے علاوہ جن دیگر سیاست دانوں کے انٹرویوز اس میں شامل ہیں ان میں اندر جیت گپتا، ملائم سنگھ یادو، فاروق عبداللہ، راجیش پائلٹ، مادھو راؤ سندھیا، غلام نبی آزاد اور سیف الدین سوز کے نام قابل ذکر ہیں“۔

اس کے علاوہ ان کی مزید چھ کتابیں شائع ہوئیں۔ دارالمصنفین کے ادبا

(2013)، ارمغان شبلی (2013)، نقوش عینی (2012)، عوامی ذرائع ترسیل وابلاغ اور تعمیر وترقی (2002)، غزلیات میر کی اسلوبیات (2003) اور فاصلاتی نظام تعلیم اور اُردو۔ جبکہ انھوں نے گیارہ کتابیں ایڈٹ کیں۔ انھوں نے درجنوں ملکی و بین الاقوامی سمیناروں، کانفرنسوں اور ورک شاپس میں شرکت کی۔ انھوں نے متحدہ عرب امارات، تھائی لینڈ، ساوتھ افریقہ، سنگاپور، بھوٹان، لیبیا اور ایران کے دورے کیے۔ متعدد اداروں نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں ایوارڈوں سے نوازا۔ وہ متعدد تعلیمی و رفاہی اداروں کے رکن اور ذمہ دار کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ وہ پی ایچ ڈی اور ایم فل کے اگزامنر رہے۔ یو جی سی کی متعدد کمیٹیوں میں بحیثیت رکن و آبزرور بھی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے 2000 میں مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے نئی دہلی کے اسسٹنٹ ریجنل ڈائرکٹر کی حیثیت سے یونیورسٹی کو جوائن کیا۔ 2002 میں انھیں ریجنل ڈائرکٹر انچارج بنایا گیا۔ اس منصب پر وہ 2004 تک رہے۔ 2004 سے 2010 تک ریجنل ڈائرکٹر اور اس کے بعد سے سبکدوشی تک ریجنل ڈائرکٹر پروفیسر گریڈ رہے۔

ایک زمانے میں شاہد صاحب کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وزرا، سیاست دانوں، سرکاری حکام، پروفیسروں اور بڑی مذہبی شخصیات سے ان کے بڑے اچھے مراسم رہے ہیں۔ لیکن وہ ایک بااصول انسان بھی ہیں۔ جو بھی ان کے اصول کے معیار پر کھرا نہیں اترا اس سے انھوں نے قطع تعلق کر لیا۔ گویا چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ، پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں۔ آج بھی ان کے دوستوں کا حلقہ بڑا ہے جن میں غیر مسلم بھی شامل ہیں۔ اردو کے علاوہ ہندی اور انگریزی کے صحافیوں سے بھی ان کا یارانہ ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ سبھی ان کا بہت لحاظ اور ان سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اگر انھوں نے اپنے تعلقات کو استعمال کیا ہوتا تو بہت زیادہ ترقی کرتے۔ لیکن انھوں نے اصول پسندی کو اپنایا اور کسی لالچ یا طمع کا شکار ہونے کے بجائے رزق حلال کو ترجیح دی۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگر ان کی عزت نفس کو ٹھیس نہ لگے تو وہ دوسروں کی مدد بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کرتے ہوئے

اپنے چند دوستوں کو مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد اور بعض دیگر اداروں میں ملازمت دلوائی ہے۔

انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی۔ گریجویشن جامعہ ملیہ اسلامیہ سے، پوسٹ گریجویشن (اردو) مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے اور ایم فل اور پی ایچ ڈی جواہر لعل نہرو یونیورسٹی (جے این یو) سے کیا۔ گویا ان کے کردار کی تشکیل میں تین اعلیٰ دانش گاہوں کے تہذیبی وثقافتی ورثے کا دخل ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان کے اندر جو ذہنی توسع اور کشادگی ہے وہ انہی تعلیمی اداروں کی دین ہے۔ جبکہ ان کی شرافت وایمانداری اور ان کے اعلیٰ کردار کی تشکیل میں ان کے خاندانی پس منظر نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

مئی/ 2021

OO

مولانا عزیز عمر سلفی

یکے از اصحاب ثلاثہ

دہلی کی جامع مسجد کے شمال مغربی کونے پر ایک پتلی سی گلی ہے جس کا نام ''گلی چاہ رہٹ'' ہے۔ اس گلی میں داخل ہوتے ہی بمشکل چار پانچ قدم کے بعد بائیں جانب ایک بڑا سا کنواں ہے جو اب اوپر سے ڈھک دیا گیا ہے اور دروازہ لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔ گلی چاہ رہٹ کی وجہ تسمیہ یہی رہٹ والا کنواں ہے۔ روایت ہے کہ مغل دور میں یا اس کے بعد اس کنویں میں ایک رہٹ نصب تھا جس سے پانی نکالا جاتا جو ایک نہر کے ذریعے جامع مسجد میں پہنچتا تھا۔ رہٹ ایک بہت بڑی چرخی ہوتی ہے جو کنویں میں فٹ کر دی جاتی ہے۔ اس میں ٹن کے پیپے باندھ دیے جاتے ہیں۔ رہٹ کو کھینچنے کے لیے بیلوں یا اونٹوں کا استعمال ہوتا تھا۔ جب وہ چرخی چلتی ہے اور پیپے نیچے پانی کی سطح پر پہنچتے ہیں تو ان میں پانی بھر جاتا ہے۔ پھر جب چرخی کے ساتھ وہ پیپے اوپر آتے ہیں اور جب ایک چکر لگا کر پھر نیچے کی طرف جھکتے ہیں تو ان کا پانی کنویں کی جگت کے پاس بنی ہوئی نالی میں گرتا ہے۔ اس طرح مسلسل پانی نکلتا اور گرتا رہتا ہے۔ اب تو رہٹ کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اس کنویں کے پاس سے ایک راستہ بائیں جانب گیا ہوا ہے اور دوسرا دائیں جانب۔ بائیں جانب کا راستہ اندر اندر چاوڑی بازار اور نئی سڑک کی طرف نکل جاتا ہے۔ دائیں جانب کے راستے پر چند قدم چلنے کے بعد بائیں ہاتھ پر ایک مسجد پڑتی ہے۔ اس کے بعد وہاں ایک اور راستہ پھوٹتا ہے جو بائیں طرف کو جا کر جامع مسجد دہلی کی شمالی

جانب واقع پولیس اسٹیشن کی طرف نکلتا ہے اور وہی راستہ سیدھے لال قلعہ کی طرف اور بائیں جانب دریبہ کلاں کی طرف جاتا ہے۔ جبکہ رہٹ کے کنویں کی طرف سے آنے والا راستہ آگے جا کر بند ہو جاتا ہے۔ اس سے پہلے دائیں جانب ایک تنگ اور نیم تاریک سی گلی پڑتی ہے۔ وہ ہے تو چھوٹی سی لیکن دو جگہ مڑتی ہے اور وہ ہمیں دائیں جانب ایک داخلی دروازے میں لے جا کر چھوڑ دیتی ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی سامنے مکان ہے جس کے کمرے اب ہینڈی کرافٹس کے کاروبار کے لیے وقف ہو گئے ہیں۔ پہلے یہ رہائشی کمرے تھے، اب کرائے پر اٹھا دیے گئے ہیں۔ یہ پورا علاقہ ہینڈی کرافٹس کے ایکسپورٹ امپورٹ کا ایک بڑا مارکیٹ ہے۔ وہیں بائیں جانب ایک اونچا اور تاریک سا زینہ ہے جو اوپر ایک مسجد کے دروازے تک جاتا ہے۔ اوپر دائیں جانب مسجد کا دروازہ ہے اور بائیں جانب رہائشی مکانات ہیں۔ جن میں مسجد کے متولی کا بھی گھر ہے۔ یہ ایک اہلحدیث مسجد ہے۔ اسے مسجد چاہ رہٹ کہا جاتا ہے اور اسی میں ماہنامہ نوائے اسلام کا دفتر ہے۔ یہاں سے کئی دہائیوں سے مذہبی رسالہ ''نوائے اسلام'' پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ جبکہ ''مجلس الدعوۃ الاسلامیہ'' کے نام سے ایک تعلیمی و تبلیغی ادارہ بھی قائم ہے۔ مسجد میں اندر یعنی مغرب کی جانب ایک چھوٹا سا کمرہ ہے اور اس پر ایک دو چھتی پڑی ہوئی ہے۔ مشرقی اتر پردیش کے مہراج گنج ضلع میں متعدد اسکول، کالج اور مدارس چلانے والی مجلس الدعوۃ الاسلامیہ کا یہی ہیڈ کوارٹر ہے۔ اس ادارے کے تحت خالد ملی انٹر کالج تعلیم آباد مہراج گنج، اقرا انٹر کالج آزاد نگر بھٹنی کولہوئی مہراج گنج، حرا پبلک انٹر کالج نچلول مہراج گنج، الحمرا گرلس کالج تعلیم آباد کوٹوا پرتاول مہراج گنج، حرا گرلس انٹر کالج نچلول، کلیۃ امام ابن قیم کولہوئی، معہد القرآن الکریم نچلول اور المعہد الدینی قاضی پرا مہراج گنج چل رہے ہیں۔ اس ادارے کے تحت ''مکتبۃ المنار'' کے نام سے ایک مکتبہ بھی قائم ہے۔ اب یہ مسجد اور ماہنامہ نوائے اسلام لازم و ملزوم بن گئے ہیں۔ یہی مسجد مولانا عزیز عمر سلفی، مولانا افضل ندوی اور مولانا عبد الواجد فیضی کی علمی جولان گاہ بھی ہے۔ تینوں شخصیات کا یہ مثلث کئی کارنامے انجام دے چکا ہے۔ یوں تو ان تینوں میں کوئی چھوٹا

بڑا نہیں ہے لیکن مولانا عزیز عمر سلفی کی شخصیت نمایاں ہے۔

اِس مسجد سے میرا دیرینہ تعلق ہے۔ اُس وقت سے جبکہ اس میں نہ تو مجلس الدعوۃ الاسلامیہ کا دفتر تھا اور نہ ہی یہاں سے کوئی رسالہ نکلتا تھا۔ اُس وقت یہاں بڑی ویرانی چھائی رہتی تھی۔ یہ مسجد 80 کے عشرے میں ہمارے گاؤں لوہرسن بازار ضلع سنت کبیر نگر، اتر پردیش کے ایک نوجوان مولانا واجد علی کی رہائش گاہ تھی۔ مسجد کے متولی سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ انھوں نے ان کو مسجد میں قیام کی اجازت دے رکھی تھی۔ جب وہ مسجد میں ہوتے اور نماز کا وقت ہوتا تو اذان وامامت کی ذمہ داری انہی کی تھی۔ وہ دہلی میں کوئی ملازمت کرتے تھے۔ کون سی ملازمت اس پر اسرار کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اس وقت میں زیر تعلیم تھا۔ ہم لوگ یہ سنتے آئے تھے کہ مولانا واجد علی دہلی میں جامع مسجد کے علاقے میں رہتے ہیں۔ جب 1982 میں میں نے ایم اے کیا تو کچھ دنوں کے بعد میرے والد نے ملازمت کی تلاش میں مجھے دہلی بھیج دیا۔ اس وقت میں نے بھی کچھ دن اس مسجد میں گزارے تھے۔ مولانا واجد علی نے مجھے دہلی کے بعض علاقوں سے متعارف کروایا تھا۔ غالباً پندرہ دنوں کے بعد میں وطن واپس چلا گیا۔ پھر میں دوبارہ 1983 میں دہلی آیا۔ مگر اس وقت تک مولانا واجد علی دہلی کو خیر باد کہہ چکے تھے اور غالباً ممبئی یا پھر گجرات چلے گئے تھے۔ اس وقت دہلی میں میرا قیام کم وبیش دو سال رہا۔ مگر اس مسجد کی جانب جانے کا کوئی اتفاق نہیں ہوا۔

جب فروری 1987 میں میں نے ہفت روزہ اخبار نو، نئی دہلی کے دفتر میں ملازمت کر لی تو اس وقت وہاں ایک کاتب ہوا کرتے تھے جن کا نام مولانا اسرار تھا۔ وہ مسجد چاہ رہٹ میں رہتے تھے۔ اس وقت تک مولانا عزیز عمر سلفی، مولانا افضل ندوی اور مولانا عبد الواجد فیضی نے اس مسجد کو اپنا مستقر بنا لیا تھا اور وہاں سے نوائے اسلام کے نام سے ایک مذہبی رسالے کی اشاعت شروع ہو گئی تھی۔ جب اسرار صاحب کے توسط سے میں نے دوبارہ اس مسجد میں آمد و رفت شروع کی تو مذکورہ تینوں شخصیات سے تعارف ہوا جو رفتہ رفتہ تعلق میں تبدیل ہو گیا اور پھر مولانا عزیز عمر سلفی صاحب سے دوستانہ مراسم قائم

ہو گئے۔ ان سے اس ادارے کے قیام کے پہلے ہی تعارف ہو چکا تھا۔ اسرار صاحب نوائے اسلام کی بھی کتابت کیا کرتے تھے۔ (اب اس کی کمپوزنگ محمد مصطفی انصاری کرتے ہیں جو کہ روزنامہ ملاپ دہلی میں برسرروزگار ہیں)۔ ان دنوں میں بھی اکثر و بیشتر مسجد میں شب باشی کیا کرتا۔ موسم سرما میں اسرار صاحب اور بعض دوسرے کارکن دو چھتی پر سوتے تھے۔ میں بھی وہیں اپنا بستر لگا دیتا۔ جبکہ موسم گرما میں لوگ مسجد میں سوتے تھے۔

بہت دنوں کے بعد مجھے اس بات کا علم ہوا کہ مولانا عزیز عمر سلفی، مولانا افضل ندوی اور مولانا عبدالواجد فیضی صاحبان ہمارے والد مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم کے عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ وہ نہ صرف ہم لوگوں سے بلکہ ہمارے گاؤں کے بھی بہت سے لوگوں سے واقف ہیں۔ میرے ساتھ مولانا عزیز عمر سلفی کے شفقت آمیز رویے اور محبت آمیز سلوک کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ دراصل ان تینوں شخصیات کے آبائی مواضعات ضلع مہراج گنج کے جن علاقوں میں ہیں وہاں ہمارے والد نے اپنی زندگی کا بیش قیمت عرصہ تعلیم و تدریس کے حوالے سے گزارا تھا۔ لہٰذا ہمارے والد سے اس علاقے کے معزز لوگوں کے دوستانہ تعلقات قائم تھے۔

مجلس الدعوۃ الاسلامیہ کے قیام اور نوائے اسلام کے اجرا سے قبل مولانا عزیز عمر سلفی جماعت اہلحدیث کے ایک جید عالم دین مولانا عبدالحمید رحمانی صاحب کے ساتھ تھے۔ جب مولانا رحمانی نے جامعہ نگر کے مسلم اکثریتی علاقے جوگا بائی میں ایک تعلیمی ادارہ ''ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سینٹر'' اور اس کے تحت ''معہد التعلیم الاسلامی'' قائم کیا تو اس وقت وہ ان کے ساتھ ہو گئے۔ مگر بعد میں غالباً اختلافات کی وجہ سے مولانا عزیز عمر سلفی نے مولانا عبدالحمید رحمانی سے اپنا راستہ الگ کر لیا۔

وقت گزرتا گیا۔ مسجد چاہ رہٹ میں میری آمد و رفت بڑھ گئی۔ ادھر کچھ ایسے حالات بنے جو ان کے تعلیمی مشن کے لیے انتہائی سودمند ثابت ہوئے۔ مجلس الدعوۃ الاسلامیہ کی تعلیمی سرگرمیاں بڑھتی چلی گئیں اور یکے بعد دیگرے مذہبی وعصری علوم کے ادارے قائم ہوتے چلے گئے۔ ماہنامہ نوائے اسلام بھی مقبولیت کی بلندیاں طے کرنے لگا۔

مذکورہ مسجد یا نوائے اسلام کا دفتر احباب جماعت کے لیے ایک ایسا مرکز بن گیا کہ ملک کے کسی بھی کونے سے جماعت کا کوئی بھی پڑھا لکھا شخص دہلی آتا ہے تو اس کی زیارت ضرور کرتا ہے۔ بلکہ بہت سے لوگوں کی ضرورتیں بھی اسی دفتر سے پوری ہوتی ہیں۔ جن کو کہیں رہنے کا ٹھکانہ نہیں ملتا ان کے لیے نوائے اسلام کا دفتر ایک محفوظ پناہ گاہ ثابت ہوتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کے لیے اپنے دروازے وا کر دیتا ہے اور اپنی آغوش کھول دیتا ہے۔ وہاں کے ذمہ داران انتہائی فراخ دلی کے ساتھ مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام کرتے ہیں۔ مولانا عزیز عمر سلفی، مولانا افضل ندوی اور مولانا عبدالواجد فیضی میں سے کوئی نہ کوئی یہاں ضرور رہتا ہے۔ البتہ جب سے مہراج گنج ضلع میں تعلیمی ادارے قائم ہوئے ہیں مولانا عبدالواجد فیضی صاحب یہاں کم رہتے ہیں۔ ان کے اوپر ان اداروں کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری ہے۔ بہرحال کچھ بھی ہو جائے نوائے اسلام کا دفتر ہمیشہ آباد رہتا ہے۔ دہلی میں مقیم جماعت اہلحدیث کے سرکردہ علماء اور احباب کی بھی اس مسجد میں متواتر آمد و رفت رہتی ہے۔ وہیں کئی اہم اور سرکردہ علماء سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔

مولانا عزیز عمر سلفی کی مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند سے وابستگی رہی ہے۔ جب 1979 میں باضابطہ طور پر ''مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند'' کا قیام عمل میں آیا یا اس نئے نام کے ساتھ اس کی نشأۃ ثانیہ ہوئی تو اے 13 نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی میں ایک مکان کرائے پر لیا گیا اور وہیں جمعیت کا دفتر قائم ہوا اور اس کا نام ''رابطہ آفس'' رکھا گیا۔ مکان مالک کا نام سراج الدین قریشی تھا۔ اس وقت شیخ عطاء الرحمٰن مدنی صاحب جمعیت کے ناظم اعلیٰ تھے اور مولانا عبدالوحید صاحب (بنارس) صدر تھے اور مولانا سلفی صاحب آفس سکریٹری تھے۔ جبکہ اس سے قبل جمعیت کا دفتر مدرسہ ریاض العلوم میں تھا اور مولانا عبدالحمید رحمانی ناظم اعلیٰ تھے۔ اس وقت تک اس تنظیم کا نام ''جمعیت اہلحدیث ہند'' تھا اور اس سے پہلے اس کا نام ''آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس'' تھا۔ 1906 میں جب مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تحریک پر اس کا قیام عمل میں آیا تو اس کا یہی نام رکھا گیا تھا۔

مولانا عبد الحمید رحمانی کے ناظم اعلیٰ کے عہدے سے ہٹنے کے بعد مولانا عبدالسلام رحمانی کو ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ لیکن جب وہ فجی چلے گئے تو حافظ محمد یوسف کو ناظم اعلیٰ بنایا گیا۔ بعد میں مولانا عبدالوہاب خلجی ناظم اعلیٰ کے عہدے پر فائز ہوئے۔ وہ 1984 سے 1990 تک قائم مقام ناظم اعلیٰ رہے اور پھر 1990 سے 2001 تک ناظم اعلیٰ کے منصب پر فائز رہے۔ اس کے بعد مولانا اصغر امام مہدی سلفی صاحب کو ناظم اعلیٰ مقرر کیا گیا۔

جب مولانا اصغر امام مہدی سلفی صاحب نے ناظم عمومی کی حیثیت سے مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کی باگ ڈور سنبھالی ہے تو ابتدائی ایام میں مولانا عزیز عمر سلفی ان کے ساتھ رہے ہیں۔ 2004 میں جب پاکوڑ (جھارکھنڈ) میں مرکزی جمعیت اہلحدیث کی 28 ویں آل انڈیا کانفرنس کا انعقاد ہوا تو اس کی تیاریوں میں مولانا سلفی بھی پیش پیش تھے۔ مولانا اصغر امام مہدی سلفی صاحب کے ایما پر صحافیوں کی ایک ٹیم لے کر میں نے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ کانفرنس میں جماعت کی مقتدر شخصیات کو ان کی علمی و جماعتی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈز سے نوازا گیا تھا۔ ہمارے والد ماجد کو بھی ایوارڈ تفویض کیا گیا جو میں نے وصول کی تھا۔

جناب حافظ محمد یحییٰ صاحب نے جو کہ اس وقت مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے امیر تھے، پاکوڑ کانفرنس میں خطبہ صدارت پیش کیا تھا۔ میں نے پہلی بار ان کو اسٹیج پر خطبہ پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ حالانکہ اس وقت بھی وہ کافی معمر تھے لیکن انھوں نے بڑے پر جوش انداز میں اپنا خطبہ پیش کیا تھا۔ ظاہر ہے وہ کانفرنس اتنی بڑی تھی کہ جو بھی اسٹیج پر آتا وہ جوش و جذبات سے بھر جاتا تھا۔ میں نے اس سے قبل کسی اور کانفرنس میں اتنا بڑا مجمع نہیں دیکھا تھا۔ جس انداز میں حافظ یحییٰ صاحب نے خطبہ پیش کیا اس سے یہ اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ عہد شباب میں ان کے اندر کس قدر جوش و جذبہ رہا ہوگا۔ حافظ محمد یحییٰ صاحب کا 22 نومبر 2020 کو 98 سال کی عمر میں دہلی میں انتقال ہو گیا۔ وہ دہلی کے فصیل بند شہر کے ایک نامور تاجر بھی تھے۔ ان کے والد حافظ حمید اللہ بھی جماعتی و ملی

درد رکھنے والے انسان تھے۔ وہ بہت مخیّر تھے۔ ان کے مراسم سعودی عرب کے حکمراں خانوادے سے بھی تھے۔ مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کے موجودہ امیر مولانا اصغر امام مہدی سلفی کے ایک بیان کے مطابق ''حافظ حمید اللہ آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس کے نائب ناظم اور فنانشیل سکریٹری تھے۔ انھوں نے پوری عمر گلستان آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس کی باغبانی، اس کی نگہبانی، اس کی سیرابی نیز پرورش و پرداخت میں صرف کردی۔ موصوف جودوسخا کا سرچشمہ اور سخاوت و فیاضی کے سیل رواں تھے۔ آپ کے جودوسخا کا سیل رواں ہندوستان سے لے کر حجاز تک وسیع تھا۔ ہندوستان کے درجنوں مدارس آپ کے مالی تعاون سے چلتے تھے''۔ سعودی عرب میں تیل نکلنے سے قبل وہ وہاں کے لوگوں کی مالی امداد بھی کیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے وہاں کے فرماں رواؤں میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ حافظ محمد یحییٰ بھی اپنے والد کے مانند ایثار و قربانی کا جذبہ رکھتے تھے۔ ان کا انتقال جمعیت و جماعت کا ایک بڑا خسارہ ہے۔

بہرحال مولانا عزیز عمر سلفی سے جمعیت و جماعت کے تعلق سے اکثر و بیشتر گفتگو ہوتی ہے۔ ان سے ہونے والی بات چیت سے میں نے اندازہ لگایا کہ جمعیت اہلحدیث کے ماضی بعید پر بھی ان کی نظر ہے اور ماضی قریب پر بھی۔ اس کے علاوہ وہ جمعیت کی علمی وصحافتی تاریخ و خدمات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں کہ آزادی سے پہلے اور اس کے بعد کے اخبار اہلحدیث پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے خیال میں اگر اخبار اہلحدیث کی موضوعاتی زمرہ بندی کی جائے تو بہت بڑا کام ہوگا۔ ان کی گفتگو سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اخبار اہلحدیث سے ان کو جذباتی لگاؤ ہے۔ ظاہر ہے جب اس اخبار سے ہے تو اس کے بانی ایڈیٹر مولانا ثناء اللہ امرتسری سے کیوں نہیں ہوگا۔ امرتسر میں ایک بزرگ اردو صحافی ہیں جن کا نام اوم پرکاش سونی ہے۔ اس وقت ان کی عمر تقریباً 90 سال ہے۔ ان کے پاس اخبار اہلحدیث کی فائل موجود تھی لیکن انھوں نے مولانا حبیب الرحمٰن ثانی لدھیانوی کو دے دی۔ کئی سال قبل مولانا امرتسری کی حیات و خدمات پر سونی صاحب کا ایک مضمون سرکاری اردو رسالے ''آجکل'' میں شائع ہوا تو مولانا سلفی

نے کہا کہ سونی صاحب سے بات کیجیے۔ ہم لوگ امرتسر چلیں گے۔ میں نے سونی صاحب کا نمبر حاصل کر کے ان سے بات کی اور ان کے سامنے یہ خواہش رکھی کہ ہم لوگ امرتسر آنا چاہتے ہیں اور مولانا ثناء اللہ امرتسری، ان کے اخبار اہلحدیث اور ان کے ثنائی پریس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے بڑی فراخ دلی کے ساتھ کہا کہ ہاں ہاں آپ لوگ آیئے۔ مئی 2015 میں ہم دونوں امرتسر گئے۔ سونی صاحب سے ملاقات کی۔ کئی گھنٹے تک ان کے پاس رہے۔ مولانا امرتسری اور دوسرے موضوعات پر ان سے گفتگو ہوتی رہی۔ بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ سونی صاحب اردو صحافت اور اردو صحافیوں کے بارے میں بڑا علم رکھتے ہیں۔ انھوں نے بہت سے پرانے اخبارات ورسائل کے تراشے بھی دکھائے۔ امرتسر ہی میں ایک اور صحافی تھے پنڈت رام سرن اثر۔ وہ سونی صاحب کے ہمعصروں میں تھے۔ وہ تو اب دنیا میں نہیں ہیں لیکن اردو میں ان کی کئی کتابیں ہیں۔ سونی صاحب نے ان کے بیٹے کلدیپ کو بلوالیا اور وہ اپنے والد کی کئی تصنیفات لے کر آ گئے۔

بہر حال سونی صاحب نے کلدیپ کو ثنائی پریس کی لوکیشن سمجھائی اور ہم لوگوں کو ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ سونی صاحب چلنے پھرنے سے معذور ہیں۔ جب ہم لوگ مقررہ مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ ایک مکمل مارکیٹ ہے۔ وہاں بہت سے دکانداروں سے ثنائی پریس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی گئی لیکن کوئی بھی اس کی نشاندہی نہیں کر سکا۔ بلکہ لوگوں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہاں کوئی پریس بھی کبھی تھا۔ خیال رہے کہ 1947 تک وہ پریس قائم تھا اور اسی میں اخبار اہلحدیث چھپتا تھا۔ تقسیم ہند کے ہنگامہ خیز دور میں جبکہ مولانا امرتسری کے بیٹے کو ہلاک کر دیا گیا وہ پریس بھی نذر آتش کر دیا گیا تھا۔ مولانا امرتسری 1948 میں پاکستان چلے گئے تھے۔ انھوں نے وہاں سے اخبار اہلحدیث کی اشاعت کا احیاء کیا لیکن جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ بہر حال ہم لوگ کم وبیش نصف گھنٹے تک وہاں کچھ سراغ لگانے کی کوشش کرتے رہے لیکن سب بے سود۔ کوئی بھی شخص پریس کے بارے میں نہ تو کچھ جانتا تھا اور نہ ہی کسی نے اس کے بارے میں

کبھی کچھ سنا تھا۔ جبکہ سونی صاحب کا اصرار تھا کہ وہ وہی جگہ ہے جہاں ثنائی پریس ہوا کرتا تھا۔ وہاں سے ناکام و نامراد ہو کر ہم لوگ وہ مسجد دیکھنے گئے جس میں مولانا امرتسری خطبہ دیا کرتے تھے۔ مولانا امرتسری نے 1947 تک اس مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیا تھا۔ وہ مسجد تاریخی مقام جلیاں والا باغ کے قریب ہے۔ وہیں تھوڑی مسافت پر سکھوں کا مذہبی مرکز گولڈن ٹیمپل واقع ہے۔ اسی سال یعنی 2015 میں ہم نے اردو زبان کے فروغ کے لیے کام کرنے والی دہلی کی ایک تنظیم ''اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن'' کی جانب سے نومبر کو منعقد ہونے والے عالمی یوم اردو کے موقع پر مولانا ثناء اللہ امرتسری پر ایک یادگار مجلّہ شائع کروایا تھا۔ اس تنظیم کی جانب سے ہر سال اس موقع پر ایک یادگار مجلّہ شائع کیا جاتا ہے۔ مولانا امرتسری پر شائع ہونے والا مجلّہ خوب مقبول ہوا تھا۔

مولانا سلفی آزادی کے بعد دہلی سے شائع ہونے والے اخبار اہلحدیث کے تعلق سے بھی نیک جذبہ رکھتے ہیں۔ آزادی کے بعد اخبار اہلحدیث کی اشاعت کا سہرا جماعت اہلحدیث کے ایک بڑے عالم دین مولانا حکیم عبدالشکور شکراوی کے سر جاتا ہے۔ انھوں نے ایک اور بڑے عالم دین اور مدرسہ ریاض العلوم کے استاد مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی کے ساتھ مل کر اس اخبار کی اشاعت کا احیاء کیا تھا۔ یہ اخبار غالباً 1951 سے 1976 تک احاطہ کیدارہ باڑہ ہندوراؤ سے نکلتا رہا۔ مولانا سلفی صاحب کے مطابق حکیم عبدالشکور شکراوی اور مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی کے انتقال کے کافی بعد حکیم شکراوی صاحب کے فرزند حکیم اجمل خاں نے 1976 سے اس کی اشاعت کا احیاء کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ چونکہ ان کے والد نے اس اخبار کو جاری کیا تھا اور اس کو بڑی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی تھی لہٰذا اس کی اشاعت منسوخ نہیں ہونی چاہیے۔ لیکن کافی کوششوں کے باوجود انھیں اس اخبار کا ٹائٹل نہیں ملا۔ لہٰذا حکیم اجمل نے ''مجلّہ اہلحدیث'' کے نام سے جریدے کا آغاز کیا۔ حکیم اجمل صاحب تازندگی اس کو نکالتے رہے۔ سات ستمبر 2020 کو ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب اس مجلّے کی اشاعت کے سلسلے میں غیر یقینی صورت حال ہے۔

حکیم اجمل صاحب کا ایک تعارف یہ ہے کہ پہلے دہلی میں مرکزی جمعیت اہلحدیث کا کبھی کوئی مرکزی دفتر نہیں رہا۔ یہ غالباً 1982 کا واقعہ ہے۔ حکیم اجمل صاحب نے جماعت کے کچھ لوگوں کی تحریک اور بعض مخیّر حضرات کی ترغیب پر اردو بازار جامع مسجد میں مرکزی جمعیت اہلحدیث کے دفتر کے لیے ایک بڑی عمارت خریدی۔ یہ عمارت کتب خانہ انجمن کے برابر میں بندو پان والے سے لگی ہوئی گلی میں ہے۔ گلی کے اندر سامنے ہوٹل سے متصل جو عمارت ہے وہی مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کا مرکزی دفتر ہے۔ اس گلی کی ایک بڑی اور اہم شناخت یہ ہے کہ اس عمارت سے عین پہلے بائیں جانب مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی کا ادارہ ندوۃ المصنفین ہوا کرتا تھا جو اب بند ہو چکا ہے۔ وہاں سے انھوں نے مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے ساتھ انتہائی علمی ماہنامہ ''برہان'' نکالا تھا جو کئی برسوں تک نکلتا رہا۔ بہرحال جب وہ عمارت خریدی گئی تو مصلحتاً اس کی رجسٹری جماعت اہلحدیث کے دو اہم تعلیمی اداروں جامعہ سلفیہ بنارس اور جامعہ محمدیہ مالیگاؤں کے نام کرائی گئی۔ اب مولانا اصغر امام مہدی سلفی صاحب کے دور امارت میں اس کی تعمیر نو ہوئی ہے اور وہ ایک شاندار کثیر المنزلہ عمارت میں تبدیل ہو چکی ہے۔

حکیم اجمل صاحب کو 1980 میں قائم ہونے والے مولانا عبد الحمید رحمانی کے تعلیمی ادارے ''ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سینٹر'' جوگابائی کا دسمبر 1997 میں رکن نامزد کیا گیا۔ اس کے ایک ڈیڑھ سال کے بعد انھیں اس کا نائب صدر بنایا گیا۔ اور اس طرح وہ تاحیات اس ادارے کے نائب صدر اور جامعہ سلفیہ میوات ہریانہ کے سرپرست رہے ہیں۔ اس وقت مولانا محمد رحمانی مدنی ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سینٹر کے صدر ہیں۔ انھوں نے اپنے والد اور اس ادارے سے حکیم صاحب کے تعلق کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ حکیم صاحب کی نماز جنازہ انھوں نے ہی پڑھائی تھی۔ حکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات مولانا عبد الحمید رحمانی صاحب کے انتقال پر ان کے دولت خانے پر ہوئی تھی۔ چونکہ ان کا کچھ تعلق ہمارے والد سے بھی رہا ہے اس لیے وہ مجھ سے بڑی شفقت سے پیش آتے اور اکثر و بیشتر فون بھی کیا کرتے تھے۔ 1961 میں ان کے والد کے انتقال پر

ہمارے والد نے بطور خراج عقیدت ایک بھرپور مضمون ''مولانا عبد الشکور شکراوی کی یاد میں چند آنسو'' قلمبند کیا تھا جو اخبار اہلحدیث، دہلی، 15 جون تا یکم جولائی 1961 میں شائع ہوا تھا۔

چونکہ مولانا عزیز عمر سلفی مولانا حکیم عبد الشکور شکراوی اور مولانا سید تقریظ احمد سہسوانی کے تعلق سے نیک جذبات رکھتے ہیں اس لیے ان کے فرزندوں حکیم اجمل خاں اور عبد القدوس ابن احمد نقوی صاحبان کے بھی قدردان ہیں۔ حکیم اجمل صاحب مرحوم ہو چکے ہیں اور عبد القدوس ابن احمد نقوی صاحب عمر کی آخری منزل میں ہیں۔ جماعت اہلحدیث کے ایک انتہائی ذی علم اہلِ قلم ابن احمد نقوی صاحب کا مولانا سلفی صاحب بہت احترام کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نقوی صاحب جیسا ذی علم پوری جماعت اہلحدیث میں کوئی نہیں ہے۔ لیکن ان کی وہ قدر نہیں کی گئی جس کے وہ مستحق ہیں۔

خیال رہے کہ نقوی صاحب مولانا عبد الحمید رحمانی صاحب کے ادارے سے نکلنے والے ماہنامہ جریدے ''التوعیہ'' کے برسوں تک ادارتی ذمہ دار رہے۔ اس جریدے میں نقوی صاحب کے مضامین بہت پسندیدگی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔ بلکہ انھوں نے ہی کسی ماہنامہ میں طویل اداریوں کی روایت شروع کی۔ التوعیہ میں شائع ہونے والے ان کے اداریے اور مضامین بہت مقبول تھے جن میں قومی و بین الاقوامی سیاست اور حالات و واقعات کا احاطہ اور تجزیہ کیا جاتا تھا۔ یوں تو وہ نیو دہلی میونسپل کارپوریشن میں ایک گزیٹیڈ آفیسر رہے ہیں۔ لیکن ان کے مطالعہ اور ان کی علمیت کے آگے بڑے بڑے صحافی اور قلمکار بونے ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔ اردو، فارسی اور انگریزی میں شاعری کرتے ہیں۔ ملکی و بین الاقوامی سیاست و حالات پر ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ ان کے تجزیے حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں اور ان کی سیاسی پیشین گوئیاں اکثر و بیشتر درست ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی کئی تصنیفات علمی حلقوں میں شرف قبولیت حاصل کر چکی ہیں۔
جب آزادی کے فوراً بعد ہمارے والد دہلی میں زیر تعلیم تھے تو نقوی صاحب ان کے چند قریبی دوستوں میں شامل رہے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ ہم لوگوں سے بڑی شفقت

سے پیش آتے ہیں۔ وہ ہم تین بھائیوں (حماد انجم ایڈووکیٹ، سہیل انجم، ڈاکٹر شمس کمال انجم) کی متعدد کتب پر مقدمے تحریر فرما چکے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا مولانا عزیز عمر سلفی ہمارے والد ماجد کے عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ وہ ان کے متعدد تاریخی خطابات اور ان کی انتہائی مقبول نعت خوانی کے گواہ ہیں۔ جب بھی ہمارے والد کا ذکر چھڑتا ہے تو وہ بڑے والہانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں اور ان کی مقبولیت کے حوالے سے متعدد واقعات بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مولانا انجم صاحب جس دینی جلسے میں پہنچ جاتے تھے اس کی کامیابی یقینی ہوتی تھی۔ ان کی موجودگی جلسے کی کامیابی کی ضمانت ہوتی تھی۔ جب فروری 2013 میں ہمارے والد کا انتقال ہوا تو انھوں نے ماہنامہ نوائے اسلام میں ایک انتہائی شاندار مضمون لکھ کر انھیں خراج عقیدت پیش کیا اور اپنے قریبی تعلق کا ثبوت دیا۔ انھوں نے لکھا:

''یوں تو وہ انجم تھے لیکن ان کی ذات سراپا انجمن تھی۔ وہ حوصلہ مند اور پُر بہار اور رعب دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ مایوسی و نامرادی، بے حسی و بے عملی، سستی و غفلت، افسردگی و شکستگی کو گناہ سمجھتے تھے۔ ان کے پاس حوصلوں کی بجلیاں تھیں۔ وہ موج بے کراں تھے۔ وہ تیز گام تھے۔ وہ فرزندان اسلام کے عزت و ناموس کے متلاشی تھے۔ ذوق وشوق اور عزم وحوصلہ کو جوان رکھنے کے لیے ہمیشہ بگل بجاتے رہے۔ راہ منزل میں آبلہ پا ہوکر، شکستہ دل ہوکر یا شکستہ دست و پا ہوکر کھڑے رہنا ان کو گوارہ نہیں تھا۔ کھڑے ہوکر سستانا بھی ان کے مزاج اور فکر وعقیدہ کے خلاف بات تھی''۔

انھوں نے ضلع مہراج گنج سے ہمارے والد کے تعلق کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''انجم صاحب نے ضلع مہراج گنج میں بھی اپنی گہری چھاپ چھوڑی اور وہاں محبت کے جلوے بکھیر کر رکھ دیے۔ مہراج گنج ساڑھے 29 کلومیٹر کے رقبہ میں پھیلا ہوا ضلع ہے اور گونا گوں قدرتی مناظر سے گھرا ہوا ہے۔ مگر وہ ہمیشہ تعلیم وثقافت سے نا آشنا اور محروم رہا ہے۔ انجم صاحب نے یہاں کے مسلمانوں کو جھنجھوڑا، ان میں شوق عمل پیدا کیا، ان کو جدوجہد کا راستہ دکھایا۔

ضلع میں جلسے و جلوس اور انجمنوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ مٹھی بھر افراد اہلحدیث کی، جو دو چار گاؤں میں پائے جاتے تھے، عزت بڑھ گئی۔ ان کی تعلیمی، دینی ودعوتی جد وجہد کے نتیجے میں ضلع کے تمام مکاتب فکر کی بستیوں، اداروں اور مدرسوں میں بھی ان کی نعتوں اور تقریروں کے چرچے ہونے لگے۔ مولانا حسین احمد مدنی کے شاگردوں کے ایک مدرسہ میں مفسر قرآن مولانا عبدالقیوم رحمانی مقرر خاص تھے۔ اس اجلاس کے اشتہار میں انجم صاحب بایں القاب مشتہر تھے: ''رئیس المتکلم، فصیح اللسان۔ بلیغ المتکلم، نغیض البیان۔ مداح رسولؐ، شاعرِ نغمات۔ ابوالمآثر ڈاکٹر حامدالانصاری انجم جمال اثری بارگاہِ رسالت مآبؐ میں نذرانۂ عقیدت پیش فرمائیں گے''۔ یہ اشتہار ہمارے علماء کے اقدار اعلیٰ کا جس قدر معترف ہے وہ بالکل نمایاں ہے۔ اس سے تمام مکاتب فکر کے حلقوں میں انجم صاحب کی قبولیت عامہ، ادب واحترام اور قدر ومنزلت کا پتہ چلتا ہے''۔

مولانا سلفی کے مطابق:

''انجم صاحب نے اپنی دلچسپیوں سے ضلع مہراج گنج کے کولہوئی بازار اور ترکلوا کے مضافات کو زندہ و پائندہ کردیا۔ خالد ملی اسکول تعلیم آباد کا سنگ بنیاد بھی انہی کے دست مبارک سے رکھا گیا۔ مہراج گنج نے انہیں ہمیشہ اپنا محسن اور گھر کا عالم سمجھا اور انہیں بے پناہ محبت دی۔ 2008 میں ضلعی جمعیت اہلحدیث کی جانب سے پہلا اجلاس عام انہی کی نظامت میں زیر صدارت مفسر قرآن مولانا عبدالقیوم رحمانی رحمہ اللہ منعقد ہوا تھا جو اقراء جونیئر ہائی اسکول (اب انٹر کالج) کے زیر اہتمام ہوا تھا جس میں پورے ضلع کے لوگوں نے ان سے ملاقات کی تھی اور خلوص ومحبت کا نذرانہ پیش کیا تھا۔ اس مبارک موقع پر مفسر قرآن مولانا عبدالقیوم رحمانی رحمہ اللہ، انجم صاحبؒ اور مولانا عبدالرحیم امجد صاحب نیپالی اور اس وقت کے صوبائی جمعیت

اہلحدیث مشرقی یوپی کے امیر مولانا ابوالعاص وحیدی اور دیگر کئی دینی وملی شخصیات اور اہل علم حضرات نے مجلس الدعوۃ الاسلامیہ (نوائے اسلام) کے تعلیمی نشاطات کو شرف زیارت بخشا تھا جن میں خاص طور پر کلیہ امام ابن قیم کولھوئی، حرا پبلک اسکول (انٹر کالج) نچلول اور حرا گرلس اسکول نچلول، معہد الدینی پپرا قاضی، خالد ملی انٹر کالج تعلیم آباد پرتاول، الحمراء گرلز اسکول تعلیم آباد وغیرہ شامل تھے"۔

ہمارے والد سے مولانا عزیز عمر سلفی صاحب کے عقیدت مندانہ تعلق کا ہی یہ ثبوت ہے کہ جب بھی دہلی میں واقع ان کے دفتر میں اس علاقے کا کوئی شخص آتا ہے اور وہ ہمارے والد کا شناسا یا عقیدت مند ہوتا ہے تو مولانا سلفی صاحب مجھے فون کرکے کہتے ہیں کہ انجم صاحب کے چاہنے والے آئے ہوئے ہیں۔ اگر ان سے ملاقات کرنی ہو تو آجایئے۔ دو چار مہینے میں کوئی نہ کوئی ایسا شخص ان کے دفتر ضرور وارد ہو جاتا ہے اور پھر اس حوالے سے میرے پاس ان کا فون آتا ہے۔

مولانا سلفی صاحب کی خواہش پر میں نے مارچ 2021 کے اوائل میں اپنے چھوٹے بھائی ڈاکٹر شمس کمال انجم کے ساتھ کلھوئی، پڑتاول بازار، ترکلوا اور دیگر مقامات کا دورہ کیا اور ان کے اداروں کو دیکھا۔ ہمارے ساتھ ہمارے ہی گاؤں کے مولانا محمد علی فیضی اور مولانا عبداللہ فیضی صاحبان بھی تھے۔ کلھوئی میں ہمارے والد کے بے شمار عقیدت مندوں سے بھی ہم لوگوں کی ملاقات ہوئی جن میں مولانا شمیم عرفانی اور دوسرے بہت سے علماء وغیر علماء قابل ذکر ہیں۔

دسمبر 2020

OO

شیخ صلاح الدین مقبول احمد

شرافت وعلمیت کا قطب مینار

یہ 1990 کی بات ہے۔ عراق کے صدر صدام حسین کے حکم پر عراقی افواج نے کویت پر حملہ کر دیا تھا۔ اس صورت حال نے پوری دنیا کے مسلمانوں کو اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ عراقی افواج کا آپریشن تو محض دو دن جاری رہا لیکن کویت پر عراق کا قبضہ سات ماہ تک جاری رہا۔ اقوام متحدہ نے قبضہ ختم کرنے کے لیے ایک تاریخ مقرر کی مگر عراق نے اس پر عمل نہیں کیا۔ لہٰذا اقوام متحدہ کی قیادت میں اتحادی افواج نے فوجی مداخلت کی اور اس طرح عراق کو کویت سے نکالا جا سکا۔ لیکن عراقی افواج نے جاتے جاتے کویت کے چھ سو تیل کے کنوؤں کو نذر آتش کر دیا۔ انہی ایام میں میرے بزرگ دوست اور ماہنامہ نوائے اسلام کے مدیر مولانا عزیز عمر سلفی نے کہا کہ میں ذاکر نگر آ رہا ہوں۔ ہم لوگ ایک صاحب سے ملنے چلیں گے۔ آپ کو نوائے اسلام کے لیے ان کا انٹرویو کرنا ہے۔ لہٰذا ہم دونوں ذاکر نگر کی مین روڈ پر واقع مولانا عبد الحمید رحمانی کی کثیر منزلہ عمارت جسے ان کے ادارے کے کچھ لوگ وہائٹ ہاؤس بھی کہتے تھے، پہنچے۔ وہاں شیخ صلاح الدین مقبول صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے ہم دونوں کا پر تپاک استقبال کیا۔ مجھے ان کا سراپا بڑا پر کشش لگا۔ خوبصورت چہرہ، سیاہ اور چمکیلی ریش مبارک۔ علمیت سے پُر آنکھیں، شگفتہ انداز گفتگو اور متناسب ڈیل ڈول۔ میں ان سے غائبانہ طور پر واقف تھا۔ شرف ملاقات کبھی حاصل نہیں ہوا تھا۔ مولانا عزیز عمر سلفی صاحب

نے بتایا کہ آپ کویت کی وزارت اوقاف واسلامی امور کے شعبۂ مساجد سے امام وخطیب کی حیثیت سے منسلک ہیں۔ آجکل آئے ہوئے ہیں لہٰذا ان سے کویت کے موجودہ حالات پر گفتگو کرنی ہے۔ بہرحال ان سے انٹرویو کیا گیا۔ انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ کویت کے حالات بتائے۔ انھوں نے عالم اسلام کے حالات پر بھی روشنی ڈالی۔ انھوں نے گفتگو انتہائی سلیقے سے کی اور ہر سوال کا مفصل جواب دیا۔ گویا ان سے میری پہلی ملاقات کافی بھرپور رہی۔ جب کویت کے حالات بہتر ہو گئے تو وہ واپس چلے گئے۔ پھر ایک طویل عرصے تک ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔

البتہ جب کئی برسوں کے بعد سنہ 2012 میں ہندوستان کے ان کے بعض مخلص احباب نے ان کو ایک ذمہ داری تفویض کی تو دہلی میں ان کے قیام کا دورانیہ بڑھ گیا اور وہ ملک کے مختلف مقامات کے دورے بھی کرنے لگے۔ ان ایام میں ان سے ملاقاتوں اور تبادلۂ خیالات کا سلسلہ تیز ہو گیا۔ کبھی کسی مسئلے پر ان کے ساتھ گفتگو ہوتی تو کبھی کسی مسئلے پر۔ ذاکر نگر کی وہ عمارت ان ملاقاتوں کی گواہ بنتی رہی جو اولین ملاقات کی شاہد بنی تھی۔ پہلی ملاقات کے کچھ دنوں کے بعد مولانا عبدالحمید رحمانی کا لڑکیوں کی تعلیم کا ادارہ ''خدیجۃ الکبریٰ گرلس پبلک اسکول'' اسی عمارت میں منتقل ہو گیا تھا۔ کئی برسوں تک اس عمارت میں وہ اسکول قائم رہا۔ اس کے بعد جب جوگا بائی میں اسکول کی عمارت کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو اسکول پھر اسی میں آ گیا۔ اب شیخ صلاح الدین مقبول احمد صاحب نے اس عمارت میں فلیٹ لے لیا ہے اور دہلی میں وہی ان کی مستقل قیام گاہ ہے۔ وہ بہت مہمان نواز واقع ہوئے ہیں۔ انھی کے مانند ان کے بیٹے بھی انتہائی خوش اخلاق اور مہمان نواز ہیں۔ لہٰذا ایسا بہت کم ہوا کہ ان کے دولت کدے پر ملاقات ہو اور خورد ونوش کی انواع واقسام کی اشیا کا اہتمام نہ ہو۔ لہٰذا بعد میں کوشش کی جانے لگی کہ ان سے کہیں اور ملاقات ہوا کرے۔ ان کے احباب نے انھیں جو ذمہ داری تفویض کی تھی اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ابوالفضل انکلیو میں جماعت اسلامی کے کیمپس کے نزدیک ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا گیا تھا۔ جہاں ان کا دفتر قائم ہوا اور وہیں سے ایک

جریدے کی اشاعت کا آغاز ہوا۔ (بعد میں حالات کے تقاضے کے تحت جریدہ کی اشاعت منسوخ کر دی گئی)۔ متعدد ملاقاتیں اس دفتر میں بھی ہوئیں۔ یہ بھی قابل ذکر ہے کہ متعدد ایسی علمی و اسلامی شخصیات سے جن سے میں غائبانہ طور پر واقف تھا، ان کے دفتر ہی میں شرف نیاز حاصل ہوا۔

ملاقاتوں میں تسلسل کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہم دونوں میں پہلے کسی حد تک اور پھر بڑی حد تک بے تکلفی ہوگئی۔ اس کے لیے میری جرأت آموزی اور اس کو ان کی خاموش حوصلہ افزائی دونوں ذمہ دار ہیں۔ اسی درمیان اردو کے کاز کے لیے کام کرنے والی دہلی کی ایک تنظیم ''اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن'' کی جانب سے نو نومبر کو منعقد ہونے والے عالمی یوم اُردو کے موقع پر ملک کے ایک جید صحافی اور اخبار الجمعیۃ کے پچیس سال تک مسلسل ایڈیٹر رہے مولانا محمد عثمان فارقلیط پر ایک یادگار مجلّہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ 1997 سے اس تنظیم کی جانب سے ہر سال ایک یادگار مجلّہ شائع کیا جاتا ہے۔ اس کی ادارت کی ذمہ داری خاکسار ہی نبھاتا آیا ہے۔ لہٰذا جب یادگار مجلّہ شائع ہوگیا تو کچھ دنوں کے بعد میں نے اس میں ترمیم و اضافہ کر کے ایک کتاب شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا نام ''مولانا محمد عثمان فارقلیط: حیات و خدمات'' رکھا گیا۔ لیکن دشواری یہ تھی کہ اس کی اشاعت کے لیے وسائل کہاں سے آئیں۔ شیخ صلاح الدین صاحب کو اس کی بھنک پڑی تو انھوں نے یہ ذمہ داری اٹھانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس طرح وہ کتاب منظر عام پر آگئی۔ بعد میں میں نے مولانا فارقلیط کے اداریوں کا ایک انتخاب ترتیب دیا جسے دہلی کے معروف اشاعتی ادارے ''ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس'' نے شائع کیا۔

جب پہلی کتاب شائع ہو کر آئی اور میں اس کے کچھ نسخے لے کر ان کے دولت کدے پر حاضر ہوا تو اس وقت بھی مولانا عزیز عمر سلفی صاحب ساتھ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان سے بیشتر ملاقاتوں کے مواقع پر مولانا سلفی صاحب ساتھ رہے ہیں۔ بہر حال ہم دونوں ان کے دولت کدے پر پہنچے تو وہاں جماعت اہلحدیث کے ایک اور نامور عالم دین مولانا سلیمان میرٹھی بھی موجود تھے۔ انھوں نے کتاب دیکھ کر اظہار مسرت کیا اور بتایا کہ

جب مولانا فارقلیط کا انتقال ہوا تو ان کی ایک نماز جنازہ جامع مسجد دہلی میں ادا کی گئی تھی اور دوسری ان کے وطن پلکھوہ، اتر پردیش میں ادا کی گئی تھی اور پلکھوہ میں انھوں نے ہی نماز جنازہ کی امامت کی تھی۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی اور دل نے کہا کہ اچھا ہوا کہ اس موقع پر مولانا سلیمان میرٹھی صاحب بھی موجود ہیں۔ گویا یہ ایک تاریخی لمحہ ہے۔ لہٰذا اسے یادگار بنانے کے لیے ہم چاروں نے کتاب کا ایک ایک نسخہ لے کر اجتماعی تصویر کشی کروائی۔ گویا سامعین کی غیر موجودگی میں اس کتاب کا تاریخی اجرا عمل میں آیا۔ وہ تصویر میرے لیے انتہائی یادگار ہے اور میرے پاس محفوظ ہے۔ شیخ صلاح الدین احمد صاحب کے ساتھ مختلف مقامات کے دوروں کا بھی موقع ملا جن میں ایک بار میرٹھ جا کر مولانا سلیمان میرٹھی کی عیادت اور ہم دونوں کے مشترکہ دوست جھنڈانگر نیپال کے مولانا عبداللہ مدنی کے ادارے کے دورے شامل ہیں۔

ان دنوں مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند میں بڑی اتھل پتھل مچی ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں بھی مولانا سلیمان میرٹھی سے تبادلۂ خیال ہوا۔ اسی مجلس میں گفتگو کا سلسلہ مرکزی جمعیت سے نکل کر ملی جماعتوں تک دراز ہو گیا اور اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ملی تنظیموں کے درمیان باہمی ربط ضبط ہونا چاہیے اور اس بارے میں ایک پلیٹ فارم تشکیل دیا جانا چاہیے۔ اس پلیٹ فارم سے خواہ مہینے میں ایک بار ہی سہی تمام ملی تنظیموں کی ایک میٹنگ ہونی چاہیے جس میں ملی مسائل پر کھل کر گفتگو ہو اور ان کے حل کی کوئی راہ نکالی جا سکے۔ دوران گفتگو حافظ سلیمان میرٹھی نے ایک تجویز رکھی کہ مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کو دوسری مسلکی جماعتوں کے ساتھ مل کر بھی کام کرنا چاہیے اور خاص طور پر جمعیۃ علماء ہند کے تعلق سے کوئی پالیسی مرتب کرنی چاہیے۔ حافظ صاحب کا کہنا تھا کہ اگرچہ جمعیۃ علماء ہند ہماری محتاج نہیں ہے لیکن اگر ہم اس کے ساتھ مل کر ملت اسلامیہ کے مفاد میں کوئی کام کریں تو بہت مناسب ہوگا۔ اس تجویز کی تائید اور لوگوں نے بھی کی لیکن بہر حال اس پر کوئی عملی قدم ابھی تک نہیں اٹھایا جا سکا۔ حالانکہ یہ تجویز بہت مناسب تھی۔

شیخ صلاح الدین مقبول احمد مجھ پر اکثر و بیشتر اپنی عنایتوں کی بارش کرتے رہتے

ہیں۔ جب ابوالفضل انکلیو میں ان کا دفتر تھا جب بھی اور جب انھوں نے شاہین باغ میں دفتر بنالیا جب بھی وہ خاص مواقع پر مجھے یاد رکھتے ہیں۔ ایسا بہت کم ہوا ہوگا کہ ان کے گھر یا دفتر میں کوئی خاص تقریب ہو اور انھوں نے مجھے فراموش کر دیا ہو۔ جب میں نے اپنے والد گرامی حضرت مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم کی شخصیت اور فن پر ایک کتاب ''انجم تاباں'' تصنیف کی تو اس پر مقدمہ انھوں نے ہی لکھا۔ اسی طرح جب میں نے عمرہ کی ادائیگی کے بعد اس کی روداد قلمبند کی تو انھوں نے اس کا بھی مقدمہ تحریر فرمایا۔ ان کی شخصیت کے مانند ان کی تحریریں بھی بڑی شگفتہ ہوتی ہیں۔ ''اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن'' کی جانب سے ایک مجلّہ جماعت اہلحدیث کے جید عالم دین، مفسر قرآن، مناظر اسلام اور جری و بیباک صحافی مولانا ثناء اللہ امرتسری کی حیات و خدمات پر بھی شائع کیا گیا تھا۔ شیخ نے اس مجلّے کے لیے بھی ایک مضمون قلمبند کیا۔ میرے بیٹے سلمان فیصل کی شادی میں بھی شیخ نے شرکت کی اور میری خواہش پر انھوں نے نکاح بھی پڑھایا۔ انھوں نے موقع کی مناسبت سے ایک مختصر خطاب کیا اور اس کے دوران ہمارے والد صاحب کا بھی ذکر خیر کیا۔ اسی طرح غریب خانے پر منعقد ہونے والی تقریبات میں بھی وہ شرکت فرما کر انھیں بابرکت بناتے ہیں۔ میں نے لفظ ''بابرکت'' کا استعمال عمداً کیا ہے۔ اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ایک انتہائی متقی اور نیک شخص ہیں۔ کسی کے بھی کام آنے میں وہ کوتاہی سے کام نہیں لیتے۔

ادھر کئی برسوں سے ہم لوگ جمعہ کی نماز جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی میں واقع رحمانی مسجد میں ادا کرتے ہیں۔ مسجد کے برابر میں ان کے بچوں کی گارمنٹس کی ایک دکان ہے۔ ہم لوگ جن میں میرے علاوہ شیخ صلاح الدین مقبول احمد صاحب، ہم دونوں کے مشترکہ دوست عبدالستار شیمم اور ایک اور دوست محمد فیروز شامل ہیں، نماز جمعہ کے بعد اسی دکان کے سامنے آکر تھوڑی دیر ٹھہرتے ہیں۔ وہیں ہم لوگوں کی ہفتہ واری ملاقات ہوتی ہے۔ وہ جگہ ایک طرح سے میٹنگ پوائنٹ بن گئی ہے۔ وہاں اور بھی دوسرے لوگوں سے ملاقاتیں ہو جایا کرتی ہیں۔ جب شیخ صلاح الدین صاحب کا قیام دہلی میں زیادہ رہنے لگا

اور فیروز صاحب کو ان کی بزرگی اور علمیت کا اندازہ ہوا تو انھوں نے ایک موقع پر ان کو زحمت دینا چاہی۔ ہوا یوں کہ انھوں نے نیو فرینڈس کالونی، نئی دہلی میں اپنا آفس کھولا۔ اس موقع پر انھوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ شیخ صاحب سے آپ کی دوستی ہے، ان سے میرے آفس کا افتتاح کروا دیجیے۔ افتتاح سے مراد دعا کروانا تھا۔ میں نے شیخ صاحب سے گزارش کی اور وہ فوراً تیار ہو گئے۔ لہٰذا مقررہ تاریخ پر ہم دونوں ان کے آفس پہنچے اور انھوں نے وہاں برکت کے لیے دعا کروائی۔ اسے دیکھ کر فیروز صاحب کے ایک عزیز نے بھی جن کا اسی عمارت میں پہلے سے دفتر موجود تھا، اپنے دفتر لے جا کر شیخ سے دعا کروائی۔ ان کے بارے میں تو مجھے نہیں معلوم لیکن فیروز صاحب کے بارے میں جانتا ہوں کہ ان کے بزنس نے ترقی کی منازل طے کرنی شروع کر دیں۔ لہٰذا آج وہ ایک انتہائی کامیاب بزنس مین ہیں۔ ان کی دولت و جائداد میں اللہ تعالیٰ نے بے تحاشہ برکت دی۔ کاروبار خوب پھل پھول رہا ہے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہ شیخ صاحب کی دعا کا نتیجہ ہے جو انھیں اتنی کامیابی نصیب ہوئی ہے۔

شیخ صاحب ایک ذی علم شخصیت کے مالک ہیں بلکہ ان کی اصل شناخت ان کی علمیت ہی ہے۔ عربی اور اُردو میں ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کا ذکر آگے آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں مالی اعتبار سے بھی کافی فراغت دی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے اندر غرور و تکبر نام کی کوئی شئے نہیں ہے۔ ان سے میں نے جب بھی کسی ضرورت مند کے لیے کچھ کہا تو انھوں نے فوراً توجہ فرمائی۔ وہ جمعیت و جماعت کی ذی علم اور سر کردہ شخصیات کے بڑے قدر دان ہیں۔ مولانا عبد الحمید رحمانی صاحب کے وہ بہت قریب رہے ہیں۔ انھوں نے ان کو اپنے ادارے "ابوالکلام آزاد اسلامک اویکننگ سینٹر" جوگا بائی کی اسلامک ریسرچ اکیڈمی کا ڈائرکٹر مقرر کیا ہوا تھا۔ وہ اس منصب پر ستمبر 1990 سے اپریل 1993 تک فائز رہے۔ اس کے علاوہ وہ اس ادارے کے ممبر بھی ہیں۔ جماعت کی ایک انتہائی ذی علم شخصیت اور معروف قلمکار جناب عبد القدوس اطہر نقوی کی بھی (جن کا ذکر گزشتہ مضمون میں آ چکا ہے) آپ دل سے قدر کرتے ہیں۔ جمعیت و

جماعت کے حوالے سے باہمی رشتوں کے درمیان میں آنے والے ایک ناخوشگوار موڑ کو چھوڑ دیں تو ایسا کبھی نہیں رہا کہ دونوں میں خوشگوار مراسم نہ رہے ہوں۔ کچھ دنوں قبل میرے ذہن میں اس سوال نے سر اٹھایا کہ آج تک کسی نے ابن احمد نقوی جیسی ذی علم شخصیت کی علمی خدمات پر کوئی کتاب کیوں نہیں تصنیف کی یا ترتیب دی۔ بہت غور وفکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ چونکہ وہ ایک انتہائی خوددار اور گوشہ گیر اور نمود ونمائش سے دور رہنے والے شخص ہیں اس لیے نہ تو انھوں نے اس جانب کبھی کوئی توجہ دی اور نہ ہی کسی کا ذہن اس طرف کو گیا۔ لہٰذا میں نے یہ سوچ کر کہ ان کی حیات وخدمات پر ایک کتاب ضرور شائع ہونی چاہیے یا کم ازکم ان کے مضامین کا انتخاب ہی شائع ہو جائے، اس کا ذکر مولانا عزیز عمر سلفی اور شیخ صلاح الدین مقبول صاحبان سے کیا تو ان دونوں نے اسے بہ نظر تحسین دیکھا اور کہا کہ یہ کام ضرور ہونا چاہیے۔ لیکن بڑا سوال یہ تھا کہ ان کے مضامین جو اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں ان کو کیسے یکجا کیا جائے۔ یہ ذمہ داری شیخ صلاح الدین صاحب نے اٹھائی اور صرف یہی نہیں بلکہ انھوں نے اس کتاب کی اشاعت کے مراحل میں بھی شرکت کا وعدہ کیا۔ خیر انھوں نے ہی نقوی صاحب کے مضامین کو یکجا کرنے کی ذمہ داری اپنے سکریٹری مولانا عبد القدیر کو تفویض کر دی۔ انھوں نے ماہنامہ آجکل کے سائز پر چھپنے والے ماہنامہ ''التوعیہ'' میں شائع ہونے والے ان کے مضامین کو یکجا کیا جو تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔ پندرہ روزہ ترجمان اور دوسرے رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے ان کے مضامین الگ ہیں۔ دعا ہے کہ یہ کام جلد از جلد پایہ تکمیل کو پہنچ جائے۔

بہر حال شیخ صلاح الدین مقبول احمد کی ایک خوبی ان کی خوش اخلاقی اور شگفتہ مزاجی بھی ہے۔ اس کے علاوہ وہ انتہائی منکسر المزاج بھی ہیں۔ جب بھی ملیں گے نہایت خاکساری وانکساری کے ساتھ ملیں گے۔ ان کی یہ صفت کچھ خاص لوگوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ سب کے ساتھ ہے۔ ہر شخص سے انتہائی خندہ پیشانی سے ملنا ان کی فطرت ہے۔ لیکن ان کی شگفتہ مزاجی ان کی انکساری پر بھاری پڑ جاتی ہے۔ شگفتہ مزاجی کی وجہ سے ہی وہ بعض اوقات ایسی گفتگو کریں گے کہ یوں محسوس ہوگا کہ وہ خودستائی کر رہے

ہیں۔ حالانکہ وہ خودستائی نہیں ہوتی بلکہ حقیقت بیانی ہوتی ہے۔ انھوں نے انجم تاباں پر تحریر کردہ اپنے مقدمہ میں 1968 کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس وقت میں متوسطہ کا طالب علم تھا۔ مدرسہ شمس العلوم سمرا (سدھارتھ نگر، یوپی) کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں ضلع اور بیرون ضلع کے علماء وخطباء موجود تھے۔ اس اجلاس میں راقم نے ایک نظم استقبالیہ پیش کی۔ اس پر ناظم اجلاس کی حیثیت سے تبصرہ کرتے ہوئے انجم صاحب (مولانا حامد الانصاری انجم) نے فرمایا تھا کہ یہ بچہ اگر شاعری کرتا رہا تو اپنے دور کا اقبال ہوگا۔ اتفاق دیکھیے کہ بعد میں انھوں نے شاعری ترک کردی۔ لیکن ان کے اندر کا ''اقبال'' زندہ رہا اور انھوں نے کئی عشروں کے بعد ایک بار پھر مشق سخن شروع کی اور دیکھتے ہی دیکھتے کئی شعری مجموعے جن میں ایک مسدس بھی شامل ہے، زیور طباعت سے مزین ہوکر منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ وہ مصلح نوشہروی تخلص کرتے ہیں۔ مذکورہ واقعہ کا ذکر وہ بار بار کرتے ہیں۔ اس طرح شاید وہ اپنے احباب کو یہ یاد دلانے کی کوشش کرتے ہوں کہ ''اقبال ابھی زندہ ہے''۔

بہر حال جب ان کی ''مسدس شاہراہ دعوت'' منظر عام پر آئی تو میں نے اس پر ایک بھرپور تبصرہ کیا۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے کچھ اقتباسات اس مضمون میں شامل کردیے جائیں تاکہ ان کے شعری کمالات پر بھی کچھ روشنی پڑ جائے۔ وہ تبصراتی مضمون تقریباً ایک درجن اخبارات ورسائل میں شائع ہوا تھا۔ اس کے کچھ اقتباسات پیش ہیں:

''شیخ صلاح الدین مقبول احمد کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ ان کے نام کا اثر ان کی شخصیت پر بھی پڑا ہے اور وہ علمی حلقوں کے ساتھ ساتھ عوامی حلقوں میں بھی بے حد مقبول ہیں۔ ہندوستان سے لے کر عالم عرب تک ان کی ایک خاص شناخت ہے اور انھیں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ ایک ذی علم شخصیت کے مالک ہیں اور اپنی صاف گوئی کے ساتھ ساتھ تبحر علمی کی وجہ سے بھی جانے جاتے ہیں۔ وہ سردست کویت میں برسرکار ہیں اور وہاں تحقیق وتصنیف کے ایک انتہائی اہم شعبے سے وابستہ ہیں۔ کویت اور دیگر ممالک کے اصحاب علم انہیں تکریم کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اسلامی

موضوعات پر اب تک ان کی متعدد تحقیقی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ لیکن ابھی تک یہ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ وہ ایک بہت اچھے شاعر بھی ہیں اور اسلامی فکر و فلسفے کی بنیاد پر شاعری کرتے ہیں۔ وہ روایتی شاعری کے خلاف اور پاکیزہ شاعری کے حق میں ہیں۔ بچپن سے ہی ان کا مزاج شعر گوئی کی طرف مائل تھا۔ جب تک وہ ہندوستان میں رہے اپنے اس ذوق کو جلا بخشتے رہے لیکن جب بغرض تعلیم مدینہ منورہ جانے لگے تو بقول ان کے انھوں نے اللہ سے دعا کی کہ ان کا شعر گوئی کا جذبہ ختم ہو جائے اور یہ دعا قبول ہوئی۔ شیخ صلاح الدین مصلح نوشہروی کے مطابق اس کے بعد 33 برسوں تک انھوں نے شاعری نہیں کی سوائے چند اُردو، عربی، فارسی قصائد اور کچھ برجستہ اشعار کہنے کے۔

''حالانکہ ان کے مزاج اور طبیعت میں ذوق شعر گوئی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ انھوں نے درجہ اول سے ہی شاعری شروع کر دی تھی اور اپنے اساتذہ سے اس کی داد بھی حاصل کی تھی۔ ان کے دل میں بچپن ہی میں شاعری سے جو عشق پیدا ہو گیا تھا وہ چاہنے کے باوجود ختم نہیں ہوا، نازک اور کومل احساسات کی کونپل وقت کے تھپیڑوں کے باوجود تر و تازہ رہی اور موقع ملتے ہی اس نے سر اٹھایا اور ''مسدس شاہراہ دعوت'' کے پیکر میں ڈھل کر دنیا کے سامنے جلوہ گر ہو گئی۔ میں موصوف کی ابتدائے شاعری، اس سے ترک تعلق کے اسباب اور پھر تجدید عشق کی تفصیلات پیش نہیں کروں گا، باذوق قارئین خود اس مسدس کا مطالعہ کر کے اپنے علم میں اضافہ کریں۔ ہاں اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر آنجناب نے شاعری کے ساتھ تجدید عشق نہیں کی ہوتی تو خالص اسلامی فکر کی بنیادوں پر کی گئی تعمیری شاعری کا ایک عمدہ نمونہ دیکھنے سے دنیا محروم رہ جاتی۔

''155 صفحات پر مشتمل اس مسدس کی جو فکری اور فنی خوبیاں ہیں وہ اپنی جگہ پر، لیکن تین بڑی شخصیات حضرت علامہ محمد اسحٰق بھٹی، علامہ ابن احمد نقوی اور مولانا عبدالعلیم ماہر کے اعتراف ناموں نے اس کی وقعت میں دو چند اضافہ کر دیا ہے۔ علامہ محمد اسحٰق بھٹی نے ''حرفے چند'' کے عنوان سے جو حرف تبریک لکھے ہیں وہ بقول ابن احمد نقوی ''حرف آخر'' ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا موصوف نے ایک طویل وقفے تک شاعری

ترک کر کے اپنے ساتھ ناانصافی کی ہو یا نہ کی ہو، دنیائے شعر وادب کے ساتھ ناانصافی ضرور کی ہے۔ اگر وہ اس راہ سے گریز نہ کرتے اور علمی و تحقیقی کارناموں کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ اپنے ذوق شعری کی بھی تسکین کرتے رہتے تو بلاشبہ اب تک ایسے کئی شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہوتے جن کی آج کے ماحول میں بے حد ضرورت ہے۔ یہ مجموعہ اسلامی افکار کا ایک حسین گلدستہ ہے۔ اس میں شاعر مشرق علامہ اقبال کی نظموں شکوہ اور جواب شکوہ کی زمین اختیار کی گئی ہے اور خواجہ الطاف حسین حالی کی مسدس سے متاثر ہو کر مسدس کی شکل میں یہ کتاب پیش کی گئی ہے۔ اس کتاب میں شعری وفنی خوبیوں سے قطع نظر روحانی سرشاری اور قلبی جذبات کی آبیاری کے مناظر جگہ جگہ نظر آئیں گے۔ بقول شاعر:

وجہ تالیف ہے حالی کی مسدس کا کمال
راس ہے شعر کو، شکوہ کی زمین اقبال
"جہد ناقص" میں یہ مصلح کو رہا پورا خیال
دین خالص کی وہی سرمدی دعوت ہو بحال
رب کی توفیق سے، دعوت میں توانائی ہے
شاعری کی نہیں، یہ روح کی رعنائی ہے

"انھوں نے اس مجموعہ میں خدا، عشق، بادہ وساغر اور میخانہ جیسے الفاظ کے استعمال سے عمداً گریز کیا ہے۔ اس کی وجوہات پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ کہتے ہیں "جس بندۂ عاجز نے عقائد وعبادات، تفسیر وحدیث، دفاع کتاب وسنت اور اسلامی ثقافت جیسے موضوعات پر ہزاروں صفحات پر مشتمل تقریباً تیس کتابوں کا ذخیرہ جمع کیا ہے اب اس کے ذہن وقلم کے لیے زیبا نہیں کہ وہ جام و مے، بادہ وساغر اور حسیناؤں کے قد وخدود کی تشبیب وتغزل سے ذہنی وفکری عیاشی میں مبتلا ہو"۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے قرآن و حدیث کی روشنی میں شعراء کی خصوصیات بیان کی ہیں۔ (جملۂ غیر معترضہ کے طور پر عرض ہے اور بلاشبہ مولانا موصوف بھی اس سے واقف ہوں گے کہ شاعری میں بہت سی باتیں

اشاروں اور کنایوں میں کہی جاتی ہیں اور کوئی ضروری نہیں کہ لب ورخسار، گل وبلبل، قد و گیسو اور جام و پیمانہ کا لفظی مفہوم ہی لیا جائے، شاعری میں عام طور پر ان کے معنوی اور اصطلاحی مفہوم لیے جاتے ہیں)۔ لیکن بہر حال آنجناب کے اس جذبے کی قدر کرنی چاہیے۔ پاکیزہ شاعری کی اہمیت وضرورت، کتاب وسنت میں شعرا کے اوصاف، غیر پاکیزہ شاعری کے خلاف صدائے احتجاج اور پاکیزہ شعر وسخن وقت کی ضرورت جیسے موضوعات کو انھوں نے منظوم بھی کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ جن موضوعات کو نظم کرنے کے لیے منتخب کیا گیا ہے وہ بھی خالص اسلامی ہیں۔ جیسے کہ ایمانیات، صفات باری تعالیٰ، رسالت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، محاسن اسلام، اسلام پر مخالفین کے اعتراضات اور ان کے جوابات، محدثین کرام کی مساعی جمیلہ، اور فقہائے کرام اور ان کی مساعی جمیلہ۔ آخر میں خلاصۂ کلام اور دعا بھی ہے۔

''مسدس شاہراہ دعوت کو پڑھتے وقت بلا شبہ علامہ اقبال اور ان کی نظمیں شکوہ اور جواب شکوہ یاد آجاتی ہیں اور مولانا حالی تو بہر حال یاد آتے ہی رہتے ہیں۔ کہیں اقبال کا رنگ جھلکتا ہے تو کہیں مولانا حالی کا۔ صرف ایک مثال ملاحظہ ہو۔ دلائل وجود باری کے بند میں شکوہ جواب شکوہ کی جھلک دکھائی دیتی ہے:

محو فریاد وفغاں کشتۂ بیداد آئے
بے خودی میں اسے بے ساختہ جو یاد آئے
ہاتھ اٹھیں بہر دعا، لب پہ بھی فریاد آئے
رحم بندہ پہ ہو، اور غیب سے امداد آئے
ہے وہی قاضی حاجات و مغیث خلقت
اس کی ہستی پہ ہے شاہد یہ دلیل فطرت

شیخ صلاح الدین مقبول احمد کی زندگی کا بیشتر حصہ کویت میں گزرا ہے بلکہ اب بھی وہ وہاں کے ایک علمی ادارے سے وابستہ ہیں۔ وہ کویت کی وزارت اوقاف واسلامی امور کے شعبۂ مساجد سے اپریل 1982 سے جولائی 1990 تک امام وخطیب کی حیثیت

سے منسلک رہے۔ جبکہ جمعیت احیاء التراث الاسلامی الجہر ابرانچ کویت کے شعبۂ ریسرچ اینڈ اسلامک اسٹڈیز کے 1993 سے 2012 تک صدر رہے ہیں۔ انھوں نے کویت میں ہائر سیکنڈری کے طلبہ کے علاوہ یو جی پی جی اور ریسرچ اسکالرس کو پڑھایا بھی ہے۔ عربی زبان میں ان کی 9 اور اردو میں 10 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ جبکہ انھوں نے عربی کی 12 کتب کی ایڈیٹنگ بھی کی ہے۔ اس کے علاوہ دو کتابوں کا اردو سے عربی میں ترجمہ بھی کیا ہے۔ لیکن ان کا ایک حالیہ کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کی معرکۃ الآرا تصنیف ''تذکرہ'' کا عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے یہ کام لاک ڈاؤن کے دوران کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت سے عرب کے لوگ بالخصوص رؤسا و وزرا تو واقف تھے لیکن ان کی علمی حیثیت سے لوگوں کو زیادہ واقفیت نہیں تھی۔ ان کے مضامین سوڈان، مصر، کویت اور سعودی عرب کے رسائل و جرائد میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔ ہندوستان کے بھی متعدد اخبارات اور علمی جریدے ان کے مضامین شائع کرتے ہیں۔ اس وقت وہ کویت کے ایک عربی جریدے ''امتی'' کے مشاورتی بورڈ کے صدر ہیں۔ یہ خلیجی ممالک کا ایک معیاری رسالہ ہے۔ عربی رسائل میں شائع ان کے مضامین کے صفحات کی تعداد ایک ہزار سے زائد ہے۔ ملک و بیرون ملک کے متعدد اداروں نے ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں انھیں ایوارڈ و اعزاز سے نوازا ہے۔ جبکہ عربی میں ان کی علمی و ادبی خدمات پر جے این یو کے ایک اسٹوڈنٹ سرفراز رفیع نے پروفیسر فیضان اللہ فاروقی (مرحوم) کی نگرانی میں اور ان کی شاعری پر عبدالباری شفیق نے ممبئی یونیورسٹی سے پروفیسر صاحب علی (مرحوم) کی نگرانی میں ایم فل کیا ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور نیپال کے کئی علماء اور قلمکاروں نے ان کی علمی خدمات پر مضامین قلمبند کیے ہیں۔ جبکہ ان کی تصانیف پر مقدمہ تحریر کرنے والوں میں عرب و عجم کی متعدد شخصیات شامل ہیں۔ کئی مصنفوں نے اپنی کتابیں ان کے نام معنون کی ہیں۔ وہ متعدد تعلیمی اداروں سے مختلف ذمہ دارانہ حیثیتوں سے بھی وابستہ ہیں۔

دسمبر 2020

الشیخ دکتور عبد الباری بن فتح اللہ المدنی

پیکر علم وعمل

فضیلۃ الشیخ دکتور عبد الباری بن فتح اللہ المدنی محتاج تعارف نہیں۔ وہ عالم اسلام کی ایک معروف علمی شخصیت ہیں۔ وہ تقریباً 23 برسوں تک ابوظبی امارات میں تدریسی خدمات انجام دے چکے ہیں اور اب جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ میں تقریباً آٹھ سال سے استاد حدیث ہیں۔ علامہ البانی سے بہت متاثر ہیں۔ علوم حدیث میں زبردست درک رکھتے ہیں۔ عقائد کے معاملے میں بہت پختہ ہیں۔ ان کو اپنے موقف میں ذرا بھی لچک گوارہ نہیں۔ جو لوگ ان کے وطن اور شہریت سے واقف نہیں اور ان کے درس میں حاضر ہوتے ہیں وہ انھیں عرب سمجھتے ہیں۔ بہت سے عرب بھی انھیں عرب ہی سمجھتے ہیں۔ جب انھیں پتہ چلتا ہے کہ وہ عجمی ہیں اور ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں تو محو حیرت ہو جاتے ہیں۔ جو عرب ان کے ہندوستانی ہونے سے واقف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عربی نہیں کچھ اور پڑھاتے ہوں گے۔ لیکن جب ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عربی میں درس دیتے ہیں تو چونک پڑتے ہیں۔

شیخ عبد الباری حفظہ اللہ سے میری زیادہ ملاقاتیں نہیں ہیں۔ لیکن اتنی بھی کم نہیں ہیں کہ میں ان کی علمیت اور ان کے مزاج سے واقفیت نہ رکھوں۔ دوسروں سے

بھی ان کے بارے میں گاہے بگاہے کچھ نہ کچھ سننے کو ملتا رہتا ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے میں نے فروری 2017 کے نصف آخر میں عمرہ کی ادائیگی کی۔ اس موقع پر مدینہ منورہ میں اپنے ایک عزیز اور جامعہ اسلامیہ کے طالب علم مولانا محمد شعیب کے گھر ایک ہفتہ قیام رہا۔ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ 17 فروری کی شب میں سوا بارہ بجے مدینہ ایئر پورٹ پر پہنچا تھا۔ مولانا محمد شعیب نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ آپ کو ہوٹل میں نہیں ہمارے گھر رہنا ہے۔ میں نے اسے اپنے لیے خوش بختی سمجھا کہ اپنے ایک عزیز کے یہاں جو کہ فیملی کے ساتھ رہتے ہیں قیام کروں گا اور کچھ دن بچوں کے ساتھ گزاروں گا۔ ہم جب سوا بارہ بجے شب میں ایئر پورٹ سے باہر آئے تو دیکھا کہ مولانا محمد شعیب اور ہمارے ہی گاؤں کے ایک اور مولانا محمد افضل اور مولانا شعیب کے چھوٹے بھائی محمد اشرف وہاں گاڑی لے کر موجود ہیں۔ مولانا افضل اور محمد اشرف مدینہ میں برسر ملازمت ہیں۔ مولانا شعیب نے راستے میں بتایا کہ شیخ عبد الباری صاحب بھی اس وقت ریاض سے مدینہ آئے ہوئے ہیں۔ رات میں وہ کہیں کھانے پر مدعو تھے۔ انھوں نے مولانا شعیب سے بھی چلنے کو کہا۔ جس پر انھوں نے کہا کہ میں نہیں جا سکتا کیونکہ میرے چچا عمرہ کرنے آرہے ہیں اور میں ان کو لینے ایئر پورٹ جاؤں گا۔ انھوں نے پوچھا کون چچا۔ انھوں نے جواب دیا سہیل انجم، جو دہلی میں رہتے ہیں اور صحافت کرتے ہیں۔ شیخ عبد الباری صاحب نے کہا کہ ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ وہ مولانا انجم صاحب کے بیٹے ہیں۔ مولانا شعیب نے ان سے کہا کہ اگر آپ کل صبح غریب خانے پر ناشتے پر تشریف لائیں تو یہ میرے لیے سعادت کی بات ہوگی۔ شیخ نے فرمایا کہ میں ضرور آؤں گا مگر ایک شرط ہے۔ انھوں نے پوچھا کون سی شرط۔ جواب ملا کہ سہیل انجم سے ملوانا پڑے گا۔ انھوں نے کہا کہ وہ تو ہمارے پاس ہی رہیں گے۔ آپ سے تو ملاقات ہوگی ہی۔

اگلی صبح کو ان کا فون آیا کہ میں آرہا ہوں اپنے گھر کا پتہ بتاؤ۔ انھوں نے کہا کہ میں عنبریہ میں رہتا ہوں۔ آپ مسجد ترکی تک آجائیں، وہیں قریب میں میرا گھر ہے،

میں آپ کو لے لوں گا۔ عنبریہ مسجد نبوی سے قریب ہے۔ پیدل بمشکل پندرہ منٹ کی مسافت پر۔ مسجد نبوی کی اذان، اقامت اور نماز سب سنائی دیتی ہے۔ بہر حال وہ آگئے اور ناشتے کے بعد بھی کافی دیر تک بیٹھے رہے۔ خوب باتیں ہوئیں۔ ہم لوگ بچپن سے ہی ان کا نام سنتے آئے ہیں۔ میں نے جب شعور سنبھالا تو ان کی علمی خدمات سے بھی کسی حد تک واقفیت ہوئی۔ میں نے ان کی کتاب ''صفت صلوٰۃ النبی'' کا مطالعہ اسی وقت کیا تھا جب وہ منظرِ عام پر آئی تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے جو ہنگامہ خیز مقدمہ لکھا ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ بہت سے لوگوں کو اس میں کچھ متنازعہ باتیں نظر آئی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے مقدمہ میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ بھی ایک علمی کاوش سے کم نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے لوگوں کے بارے میں انھوں نے یہ سوچے بغیر کہ لوگوں کا کیا ردِ عمل ہوگا، اپنی بے لاگ رائے دی ہے۔ کسی کی رائے سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے اور اتفاق بھی۔ لیکن کسی کو اپنی رائے دینے سے روکا نہیں جا سکتا۔ رائے دینے میں ہر شخص آزاد ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہیں ہوگا کہ مذکورہ کتاب کا مقدمہ بجائے خود ایک کتاب ہے۔ اگر شیخ عبد الباری صاحب اس کو الگ سے ایک کتاب کی صورت میں شائع کریں تو وہ نہ صرف یہ کہ بہت مقبول ہوگی بلکہ اس کی بنیاد پر تاریخ سازی بھی کی جا سکے گی۔ ان کی ایک اور کتاب ''المنهل الرّوِیّ في مختصر علوم الحديث النبوی'' منظرِ عام پر آئی ہے جو در اصل ان کا تحقیقی مقالہ ہے۔

شیخ دکتور عبد الباری صاحب اتر پردیش کے سابقہ بستی ضلع اور موجودہ سنت کبیر نگر ضلع کے دریاباد سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے خاندان اور ہمارے گاؤں لوہرسن بازار کے مابین بڑا گہرا رشتہ ہے۔ یہ رشتہ نیا نہیں بلکہ تاریخی ہے۔ ان کے نانا حاجی عبد الغفور صاحب ہمارے گاؤں میں بچوں کو پڑھاتے تھے۔ شیخ عبد الباری صاحب اور ان کے بھائی مولانا عتیق الرحمٰن ندوی صاحب (عتیق اثر) نے اپنا بچپن ہمارے گاؤں میں گزارا ہے۔ اس لیے گاؤں والے ان دونوں بھائیوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کی بڑی

قدر بھی کرتے ہیں۔ دونوں بھائی بھی ہمارے گاؤں کو اپنا گاؤں سمجھتے ہیں۔ ہمارے یہاں منعقد ہونے والے علمی، ادبی، دینی و اصلاحی پروگراموں میں مولانا عتیق الرحمٰن صاحب اور دوسرے لوگ برابر شرکت کرتے ہیں۔ لوہرسن بازار کے لوگ بھی دریاباد کو اپنا گاؤں سمجھتے ہیں۔ شیخ عبدالباری صاحب نے دریاباد ہی میں کئی سال قبل ایک تعلیمی ادارہ قائم کیا ہے جس کا نام ''جامعہ اسلامیہ دریاباد'' ہے۔ جب سے یہ ادارہ قائم ہوا ہے دونوں گاؤں کا رشتہ اور مضبوط ہو گیا ہے۔ ہمارے گاؤں کے بیشتر بچے وہیں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ وہاں کے اساتذہ اکثر و بیشتر ہمارے گاؤں آتے ہیں۔ ہمارے خاندانی بھائی عزیزی مولانا محمد جعفر مدنی کا تعلق بھی اس ادارے سے ہے۔ ان کی وجہ سے دونوں جگہوں میں باہمی قربت اور بڑھی ہے۔ ہمارے علاقے میں جب بھی کوئی مسلکی تنازعہ پیدا ہوتا ہے تو دریاباد سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وہاں کے اساتذہ خم ٹھونک کر میدان میں آجاتے ہیں اور مسلک کے دفاع میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ شیخ عبدالباری صاحب نے لوہرسن بازار میں مسجدوں کی تعمیر میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ وہ وہاں کے تعلیمی ادارے مدرسہ مدینۃ العلوم کی ترقی کے بھی ہمیشہ خواہش مند رہے ہیں۔ وہ جب بھی اپنے وطن جاتے ہیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کچھ وقت فارغ کرکے لوہرسن بازار ضرور جائیں۔ لوہرسن بازار کے لوگوں کی بھی خواہش ہوتی ہے کہ مولانا ہمارے یہاں تشریف لائیں اور وعظ و خطاب فرمائیں۔

شیخ عبدالباری صاحب اور مولانا عتیق الرحمٰن ندوی صاحب ہمارے والد حضرت مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم کے بڑے قدردان ہیں۔ ان کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ ہمارے والد بھی ان لوگوں کو اپنے عزیز کی طرح مانتے رہے ہیں۔ مولانا عتیق الرحمٰن صاحب ہمارے والد کے شاگرد بھی ہیں۔ جب مرکزی جمعیت اہلحدیث ہند کی جانب سے 2004 میں پاکوڑ میں 28 ویں آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس منعقد کی گئی تو اس میں شیخ عبدالباری صاحب کی تحریک پر ہمارے والد کو اعزاز سے نوازا گیا تھا۔ جب یہ طے ہوا کہ کچھ جماعتی شخصیات کی عزت افزائی کی جائے گی تو شیخ نے والد

صاحب کا نام پیش کیا تھا۔ (جیسا کہ انھوں نے مذکورہ ملاقات میں مجھ کو بتایا۔ اس سلسلے میں مولانا عزیز عمر سلفی صاحب مدیر نوائے اسلام کی کاوشیں بھی قابل قدر ہیں۔ اس موقع پر جو سند توصیف اور کتابوں کا تحفہ دیا گیا تھا وہ میں نے مولانا عزیز عمر سلفی صاحب ہی کے بدست وصول کیا تھا) اس کے علاوہ شیخ عبدالباری صاحب نے ہمارے والد کو اپنے صرفے سے حج کروایا تھا۔ جب فروری 2013 میں ہمارے والد کا انتقال ہوا تو مولانا عتیق الرحمٰن صاحب، ان کے ادارے کے اساتذہ اور بڑی تعداد میں طلبہ نماز جنازہ میں تشریف لائے تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس دن ادارے میں تعطیل کر دی گئی تھی۔ یہ ہمارے والد سے اس خاندان کی محبت آمیز قربت کا ایک ثبوت ہے۔ اسی لیے وہ خاندان ہم لوگوں سے بھی مشفقانہ انداز میں پیش آتا ہے۔ یہاں یہ ذکر بھی مناسب ہوگا کہ جب بھی ہمارے گاؤں کے کسی شخص سے شیخ عبدالباری صاحب کی ملاقات ہوتی ہے تو جہاں بہت سی باتیں زیر گفتگو آتی ہیں وہیں وہ والد صاحب کا محبت آمیز ذکر کرنا کبھی نہیں بھولتے۔ (یہ باتیں تحریر کرنے کی نہیں ہوتیں لیکن اس لیے تحریر کی جا رہی ہیں تاکہ ریکارڈ پر آجائیں اور تاریخ کا حصہ بنیں۔) اس سے قبل شیخ صاحب سے دہلی کے ذاکر نگر میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ دہلی اور یوپی کی سرحد پر موضع پاوی میں ادارہ قائم کرنے کے لیے زمین خرید رہے تھے۔ سنا ہے کہ کافی بڑا رقبہ انھوں نے خریدا ہے۔

مدینہ منورہ میں مولانا محمد شعیب کے گھر جب ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے دریاباد اور لوہرسن بازار کے باہمی رشتے کا تذکرہ کیا اور بہت سے مرحومین کے واقعات سنائے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ ایسے بہت سے لوگوں کے نام جو مرحوم ہو چکے ہیں، میں بھول گیا تھا لیکن ان کو یاد تھے۔ انھوں نے اپنے بچپن کے کچھ واقعات بھی سنائے اور اس کا بھی اظہار کیا کہ وہ لوگ ہمارے والد سے کتنی محبت کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بھی انھوں نے ایسی بہت سی باتوں پر سے پردہ اٹھایا جن سے میں واقف نہیں تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ وہاں سے روانہ

ہوئے۔ رات میں انھوں نے عزیزم مولانا شعیب کو فون کیا اور مجھ سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ کافی دیر تک مختلف امور پر گفتگو ہوتی رہی۔ اگلی صبح پھر ان کا فون آیا اور پھر پندرہ بیس منٹ تک بات چیت ہوئی۔ انھوں نے جس خلوص، محبت اور اپنائیت سے مجھ سے مشفقانہ گفتگو کی اس نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ میں تو پہلے سے ہی ان کا قدردان تھا لیکن اس ملاقات نے میرے جذبات واحساسات کو اور گہرا کر دیا اور مجھے ان سے دلی لگاؤ سا پیدا ہو گیا ہے۔

مارچ 2017

OO

مودود صدیقی

ایک انوکھی شخصیت

مودود صدیقی صاحب سے میری پہلی ملاقات 1989 میں دہلی کے ترکمان گیٹ پر واقع ہفت روزہ ''اخبار نو'' کے دفتر میں ہوئی تھی۔ اس وقت میں اخبار نو کے شعبۂ ایڈیٹوریل میں کام کر رہا تھا۔ سرکولیشن منیجر شمیم اختر تھے اور عبد السبحان ان کے معاون تھے۔ مدیر اعلیٰ جناب م۔ افضل نے اخبار کی سرکولیشن کا مزید کام دیکھنے کے لیے مودود صدیقی کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس وقت ان سے سرسری ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ پھر میں اخبار نو سے کہیں اور چلا گیا۔ لیکن ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر یہ ملاقاتیں تعلق میں بدل گئیں۔ تعلق کے ابتدائی ادوار کی بنیاد پر مودود صدیقی کی تہ دار شخصیت کو سمجھ پانا کسی کے لیے بھی آسان نہیں۔ کیونکہ لوگ ظاہری شکل وصورت اور قد کاٹھی سے ہی کسی بھی شخص کی صلاحیت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ظاہری شخصیت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔ ظاہری جسامت سے الگ ایک باطنی جسامت بھی ہوتی ہے اور حقیقتاً وہی اصل شخصیت ہوتی ہے۔ ظاہری جسامت محض ایک خول یا موجودہ تجارتی زبان میں کہیں تو پیکنگ کا کام کرتی ہے۔ جبکہ باطنی شخصیت پیکنگ کے اندر کا مال ہوتا ہے۔ باطنی شخصیت کی تشکیل شخص کے ذاتی کردار سے ہوتی ہے جس میں اس کی اپنی سوچ، لوگوں سے تعلقات نبھانے کے ہنر اور معاملات کو برتنے کی ذاتی صلاحیت کے ساتھ ساتھ خاندانی پس منظر بھی کام کرتا ہے۔ لہٰذا مودود صدیقی صاحب کو سمجھنے میں مجھے

ایک عرصہ لگا۔ وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جن کو پہچاننے کے لیے چند ملاقاتیں ہی کافی ہوتی ہیں۔ ان کو سمجھنے اور پرکھنے کے لیے ان کی شخصیت کی گہرائی میں اسی طرح اترنا پڑتا ہے جس طرح سمندر کی گہرائی ناپنے کے لیے موجوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اور تھپیڑوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بہت دور تک جانا پڑتا اور جان کو جوکھم میں ڈالنا پڑتا ہے۔ لیکن جس طرح سمندر کو پایاب نہیں کہا جاسکتا اور اس کی گہرائی کو ظاہری آلات سے نہیں ناپا جاسکتا اسی طرح مودود صدیقی کی شخصیت کے بارے میں بھی کوئی ایک رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ ان کے بارے میں کوئی بھی رائے شاید ایسی نہیں ہوسکتی جو ان کی پہلودار شخصیت کا مکمل طور پر احاطہ کرسکے۔ اس لیے ان کے بارے میں لوگوں کی ان آراء کو کہ وہ ایک مجاہد اردو ہیں، وہ ایک زبردست صحافی ہیں، وہ ایک قابل اور باصلاحیت منیجر ہیں، وہ ایک ہمدرد اور مخلص انسان ہیں یا وہ دوسروں کے کام آنے والے ایسے مسیحا ہیں جو صلہ وستائش کی تمنا کے بغیر اپنے مشن میں مصروف رہتے ہیں، قطع نظر کرتے ہوئے بس یہ کہنا چاہوں گا کہ مودود صدیقی جس شخص کا نام ہے وہ اپنی خوبیوں اور خامیوں کے اعتبار سے واحد ہے، اکیلا ہے، بے مثال ہے، انوکھا ہے اور لاجواب ہے۔

اگر کوئی ان کے ظاہری سراپا کا نقشہ کھینچنا چاہے یا جائزہ لینا چاہے تو ضروری ہے کہ وہ یہ کام اس وقت کرے جب وہ بیٹھے ہوئے نہ ہوں۔ رواں دواں ہوں یا پھر ساکت کھڑے ہوں۔ اگر دوران نشست ان کے سراپا کا جائزہ لیا جائے تو جائزہ لینے والا دھوکہ کھا جائے گا، فریب خوردہ ہو جائے گا۔ اسی طرح ان کے معنوی سراپا پر نگاہ ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ کام اس وقت کیا جائے جب وہ اپنے دفتر میں کام میں مشغول ہوں اور آپ چپکے سے اور اس انداز سے وہاں جاکر بیٹھ جائیں کہ وہ دیکھ نہ سکیں یا آپ پر ان کی نظر نہ پڑسکے۔ حالانکہ یہ کام بہت مشکل ہے۔ ایسے لمحات بہت کم آتے ہیں جب وہ دفتر میں کسی کی آمد سے بے خبر ہوں۔ ورنہ ان کے دل و دماغ اور ہاتھ پاؤں کے ساتھ ساتھ ان کے حواس خمسہ بھی ہمیشہ بیدار رہتے اور کام کرتے رہتے ہیں۔ ایک عام انسان جس کو اللہ نے دو ہاتھ دیے ہیں وہ اگر بہت محنتی ہے تو یہی کہا جاسکے گا کہ وہ دونوں

ہاتھوں سے کام کرتا ہے لیکن میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مودود صدیقی تین چار ہاتھوں سے کام کرتے ہیں۔ دو ظاہری ہاتھوں کے علاوہ کچھ نادیدہ ہاتھوں کی بھی کارفرمائی شامل رہتی ہے۔ کام کے دوران گردش کرتی اور چشمے کے اندر سے جھانکتی ہوئی ان کی گول گول آنکھیں بھی مصروف کار رہتی ہیں اور ان کو دھوکہ دینا بے حد مشکل ہے۔ یہ بات کہنے میں کوئی عیب نہیں کہ ایک عام جسامت والے انسان کے مقابلے میں کم جسامتی کے باوجود وہ کسی بھی دوسرے شخص سے کسی بھی کام میں مقابلہ کر سکتے ہیں اور جیت بھی سکتے ہیں۔ (ان کا قد تقریباً ساڑھے چار فٹ ہے)۔ اس میں ان کی باطنی طاقت اور قوت ارادی بہت کام آتی ہے۔ ایسی قوت ارادی میں نے کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ انھوں نے اپنی کم جسامتی پر کبھی بھی اظہار افسوس نہیں کیا یا اس پر ان کو کبھی ملال نہیں رہا بلکہ ان کا یہ عیب اکثر و بیشتر ان کا ہنر بن جاتا ہے۔ جن دنوں جناب م۔ افضل پارلیمنٹ کے رکن تھے، مودود صدیقی ان کے سکریٹری کی حیثیت سے اکثر و بیشتر ان کے ہمراہ پارلیمنٹ جایا کرتے تھے۔ وہ بہت فخر کے ساتھ بتاتے ہیں کہ اس دوران نامی گرامی ہستیوں سے ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ بارہا ایسے مواقع آئے جب ایسی ہی مختلف شخصیات نے ان سے مل کر کہا کہ انھوں نے ان کے قد کی وجہ سے ان کو پہچان لیا۔ ورنہ بصورت دیگر کوئی ضروری نہیں کہ وہ انھیں پہچان پاتے۔

م۔ افضل صاحب نے اپنی رکنیت کے دوران اردو زبان سے متعلق اتنے سوالات پارلیمنٹ میں کیے تھے کہ وہ ایک ریکارڈ ہے جو ابھی تک نہیں ٹوٹ سکا ہے اور آئندہ بھی جس کے ٹوٹنے کے امکانات نہیں ہیں۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اس ریکارڈ میں مودود صدیقی کا بھی حصہ ہے۔ سوالات سازی میں ان کی عملی شرکت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس چھ سالہ مدت میں انھوں نے بہت سے ایسے کام کیے جو عام طور پر ممبران پارلیمنٹ کے سکریٹری نہیں کر پاتے ہیں۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں۔ لیکن یہ بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ پارلیمنٹ کی رکنیت جہاں م۔ افضل صاحب کی زندگی کا ایک اہم موڑ ہے اور اس نے ان کے لیے ترقی اور کامیابی

وکامرانی کے دروازے کھول دیے ہیں وہ دور مودود صدیقی کی زندگی کا بھی ایک اہم موڑ ہے اور اس نے ان کی زندگی کے شب و روز میں بھی نمایاں تبدیلی کر دی۔ اہم اور سرکردہ شخصیات سے ملاقاتوں اور ان ملاقاتوں کی تعلقات میں تبدیلی ان کے لیے اس چھ سالہ مدت کے نمایاں واقعات میں شامل ہے۔ ان کے بارے میں جب بھی کچھ لکھا جائے گا تو اس مدت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا۔

مودود صدیقی کی زندگی بڑے نشیب و فراز سے گزری ہے۔ ایک پندرہ سالہ نوجوان کے ایک چھوٹے سے شہر امروہہ سے دارالحکومت دہلی میں منتقل ہونے سے لے کر دہلی اردو اکادمی کی جانب سے اردو صحافت کا ایوارڈ ملنے تک کے حالات پر نظر دوڑائیں تو بے شمار پڑاؤ دکھائی دیں گے۔ کچھ پڑاؤ کامیابیوں کے ہیں تو کچھ ناکامیوں کے۔ لیکن کامیابیوں کے پڑاؤں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس کا اعتراف وہ خود کرتے ہیں۔ یہ ان کی ذہانت و فطانت کی دلیل ہے کہ بہت زیادہ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے مقابلے میں زیادہ باخبر اور بعض معاملات میں زیادہ ذی علم ہیں۔ ان کی خوش قسمتی ہے کہ انھیں بڑی شخصیتوں کے ساتھ کام کرنے کے بہت مواقع ملے۔ ان مواقع سے انھوں نے فائدہ بھی اٹھایا اور صبر آزما حالات و تجربات کی بھٹی میں خود کو تپا کر کندن بھی بنایا۔ بیسویں صدی، پیام مشرق، آستانہ، نگار جدید، عوام، سو برس اور اخبار نو جیسے اداروں نے ان کی شخصیت سازی میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں اور انھوں نے ان اداروں کی نمایاں خدمات انجام دے کر نعم البدل دے دیا ہے۔

مودود صدیقی کی شخصیت بڑی ہمہ جہت ہے۔ وہ اپنے آپ میں ایک شفا خانہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کوئی بھی ''مریض'' ان کے در سے محروم نہیں لوٹتا۔ ان کے پاس ہر مرض کی تشخیص اور علاج کا ہنر ہے۔ کبھی وہ خود مرض کا علاج کر دیتے ہیں اور کبھی ''نسخۂ شفا'' تجویز کر دیتے ہیں۔ اخباروں کے ڈکلریشن سے لے کر ڈی اے وی پی اشتہارات اور پرنٹنگ سے لے کر سرکولیشن تک کے مراحل میں وہ خضر نما رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی بچے کا اسکول میں داخلہ ہو یا کسی مریض کو کسی اسپتال میں ایڈمٹ کرانا ہو،

کسی کے ریلوے ٹکٹ کو کنفرم کرانا ہو یا کسی کے راشن کارڈ کا کوئی مسئلہ ہو، پاسپورٹ کا کوئی کام ہو یا ویزے کے مراحل ہوں، کسی کی لڑکی یا لڑکے کے رشتے کا معاملہ ہو یا طلاق کے مسائل ہوں، کوئی ایسا شعبۂ حیات نہیں جس میں ان کو دخل نہ ہو۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ لفظ ناکامی ان کی لغت میں نہیں۔ کسی کا بھی اور کوئی بھی معاملہ ہو امکان کی آخری حد تک جا کر کوشش کرتے ہیں اور کامیاب لوٹتے ہیں۔ ان کے اندر انسانی ہمدردی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کسی مریض کی اسپتال جا کر عیادت کرنی ہے تو دوسرے متعلقین سوچتے رہ جاتے ہیں وہ پہلے ہی پہنچ جاتے ہیں۔

انسانی ہمدردی کے ان کے جذبے اور شرافت نفسی کے سلسلے میں ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کئی سال قبل اخبار نو میں ایک نوجوان نے ملازمت کی۔ وہ جے این یو سے اردو میں ایم اے کر چکے تھے اور پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔ وہ جناب صدیقی کے مزاج سے پوری طرح آشنا نہیں تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ صدیقی صاحب کسی بھی ناپسندیدہ بات پر بہت جلد بھڑک جاتے ہیں اور اس انداز میں بھڑکتے ہیں کہ سامنے والے کو بھی غصہ آجائے۔ ہم جیسے لوگ جو ان کے مزاج آشنا ہیں ایسے مواقع پر چپ رہتے ہیں یا ہنس کر اس لمحے کا انتظار کرتے ہیں جب ان کا غصہ فرو ہو جائے۔ وہ لمحہ چند ثانیوں کے بعد ہی آجاتا ہے۔ لیکن جو نہیں جانتا وہ ان کی بات پر مشتعل ہو جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی واقعہ اس نوجوان کے ساتھ بھی پیش آیا۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور پھر حد سے آگے گزرتے ہوئے اہانت آمیز لب و لہجہ اختیار کر لیا اور بدتمیزی سے پیش آنے لگا۔ بہر حال وہ لڑائی جھگڑا کر کے ملازمت چھوڑ کر چلا گیا۔ شاید اسے ملازمت چھوڑنے کے لیے کسی بہانے کا انتظار تھا۔ پھر اس کے بعد اس نے نہ تو مجھ سے کوئی رابطہ رکھا اور نہ ہی اخبار نو کے دفتر سے اور نہ ہی صدیقی صاحب سے۔ کم و بیش ایک سال کے بعد اچانک میرے پاس اس کا فون آتا ہے کہ این سی ای آر ٹی میں ایک جاب ویکنسی ہے۔ میں نے اپلائی کر دیا ہے لیکن میرے پاس ایکسپیرینس سرٹیفکیٹ نہیں ہے۔ آپ صدیقی صاحب سے کہہ کر اخبار نو سے ایک سرٹیفکٹ دلوا دیں۔ میں نے کہا کہ بھائی آپ تو بدتمیزی کی حد

تک لڑائی کر کے آئے ہیں وہ آپ کو سرٹیفکیٹ کیوں دیں گے۔ لیکن ان کا اصرار رہا کہ میں ان سے کہہ دوں۔ میں نے ان کو فون کیا اور پورا معاملہ بتایا۔ انھوں نے کہا کہ وہ میرے ساتھ بدتمیزی کر کے گئے ہیں میں ان کو کیسے سرٹیفکیٹ دے دوں۔ میں نے عرض کیا کہ ان کا کردار اپنی جگہ پر آپ کا کردار اپنی جگہ پر۔ آپ اس معاملے پر خاک ڈالیے اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سرٹیفکیٹ دے دیجیے، آپ کے ایک قدم سے کسی کا بھلا ہو جائے گا اور آپ کو ثواب ملے گا۔ بہر حال میں نے اس نوجوان سے کہا کہ آپ جائیے اور معافی مانگ لیجیے، آپ کا کام ہو جائے گا۔ وہ گئے اور صدیقی صاحب نے ان کو سرٹیفکیٹ بنا کر دے دیا اور انھیں وہاں ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد برسوں ہو گئے نہ انھوں نے مجھ سے کوئی رابطہ رکھا نہ ہی صدیقی صاحب سے۔ ایسے بے شمار واقعات ان کے ساتھ پیش آئے ہیں۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جنھوں نے انھیں سیڑھی کی طرح استعمال کیا اور کامیابی کے بام پر پہنچ کر لات مار کر سیڑھی نیچے گرا دی۔ لیکن یہ ان کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ ایسے بے وفا، نیکی ناشناس اور احسان فراموش قسم کے لوگ اگر مدتوں کے بعد بھی ان کے پاس آئیں یا ان سے کہیں ملاقات ہو جائے تو وہ اسی اپنائیت سے ملتے ہیں جس اپنائیت سے پہلے ملا کرتے تھے۔

دہلی اُردو اکادمی کی جانب سے ان کو صحافت کا ایوارڈ ملنا ان کی خدمات کا اعتراف ہے۔ حالانکہ میں سمجھتا ہوں کہ وہ جتنے بڑے صحافی ہیں اس سے بڑے ''صحافی گر'' ہیں۔ ایسے بے شمار صحافی مل جائیں گے جنھوں نے ان کے مشورے پر عمل کیا اور کامیابی کے ایورسٹ پر جا بیٹھے۔ لیکن اگر ایسے صحافیوں کے جلو میں مودود صدیقی کو کھڑا کر دیا جائے تو ایسے سارے صحافی ان کے سامنے بونے اور وہ قد آور نظر آئیں گے۔ انھوں نے صحافت سے متعلق ایسے بہت سے کام کیے ہیں جو غیر مربوط ہیں۔ ان کے بہت سے کاموں کے ہجوم میں ایک مربوط اور قابل ذکر کام بھی ہے اور وہ اردو اخبارات ورسائل کی ڈائرکٹری ہے۔ 1998 میں پارلیمنٹ کے انیکسی ہال میں جناب م۔ افضل صاحب کی چیئرمین شپ میں منعقدہ ''آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس'' میں جب اس

وقت کے صدر جمہوریہ کے۔ آر۔ نارائنن نے اس ڈائرکٹری کا اجرا کیا تو مبارک سلامت کا ایسا غلغلہ بلند ہوا تھا کہ مت پوچھیے۔ اس وقت ان کے اعزاز میں اور انھیں خراج تحسین پیش کرنے کے لیے ایک پروگرام منعقد کیے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا لیکن وائے افسوس کہ اس واقعہ کو ایک عرصہ گزر چکا ہے لیکن کسی صحافی کو اس فیصلے کی یاد تک نہیں آئی اور کسی نے پھر مودود صدیقی کو خراج تحسین پیش کرنے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ ڈائرکٹری سے متعلق دوسرا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ مودود صدیقی صاحب نے بھی اس پر نظر ثانی نہیں کی، اسے اپ ڈیٹ نہیں کیا۔ حالانکہ اس وقت سے لے کر اب تک دریائے جمنا میں جانے کتنا پانی بہہ گیا ہے، کتنے نامور صحافی اس دنیا سے کوچ کر چکے ہیں، کتنے اخباروں اور رسالوں نے دم توڑ دیا ہے اور صحافت کے کتنے نئے چراغ روشن ہوئے ہیں لیکن مذکورہ ڈائرکٹری کی تجدید نہیں کی گئی اسے حسب حال نہیں بنایا جا سکا۔ حالانکہ وہ اس کی تجدید کے عزم کا اظہار کرتے رہے لیکن شاید یہ سوچ کر آگے نہیں بڑھ سکے کہ جب ان کی خدمات کا کسی کو اعتراف ہی نہیں ہے تو کیا فائدہ۔ اگر ان کا اعتراف کیا گیا ہوتا تو میرا خیال ہے کہ وہ ڈائرکٹری سال بہ سال اپ ڈیٹ ہوتی رہتی۔

جناب نصرت ظہیر نے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ مودود صدیقی ٹرین کے اس انجن کی مانند ہیں جو ٹرین کو اس کی منزل تک تو پہنچا دیتا ہے لیکن اس کی اپنی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ آدھا سچ ہے۔ ان کی اپنی منزل تو ہے جس پر وہ تقریباً روزانہ ہی پہنچتے ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جب وہ کسی کے کام میں اس کی مدد نہ کرتے ہوں، اس کے ساتھ تعاون نہ کرتے ہوں۔ کامیابی کے ساتھ کام مکمل ہونے کے بعد ان کے چہرے پر طمانیت، آسودگی اور اندرونی خوشی کا جو احساس جھلکتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہی ان کا سرمایہ ہے اور وہی ان کی منزل بھی ہے۔ دہلی اردو اکادمی کی جانب سے صحافتی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ کی حصولیابی مودود صدیقی کو مبارک ہو۔ دہلی اردو اکادمی بھی مبارکباد کی مستحق ہے کہ دیر سے ہی سہی اس کی نظر ان پر گئی تو۔

جولائی 2012

پروفیسر شہپر رسول

ایک بے نیاز شخص

پروفیسر شہپر رسول سے میری شناسائی کا عرصہ پندرہ سے بیس برسوں پر محیط ہے۔ لیکن یہ شناسائی، محض شناسائی برائے شناسائی تھی۔ ان سے اکثر و بیشتر ادبی محفلوں بالخصوص جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اُردو کے پروگراموں میں شرف نیاز حاصل ہوتا یا کبھی کہیں راستے میں ملاقات ہو جاتی۔ وہ جب بھی ملے اور جہاں بھی ملے سلام کلام ہوا، دونوں نے ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی، چند رسمی فقرے ادا کیے اور پھر آگے بڑھ گئے۔ ان سے تعارف بھی سر راہ ہی ہوا تھا۔ ہم دونوں کے ایک مشترکہ دوست عمران عظیم ایڈووکیٹ نے، جو میرے دوست کم ان کے زیادہ ہیں، ان سے متعارف کروایا تھا اور یہ بتایا تھا کہ آپ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اُردو میں استاد ہیں۔ چونکہ اس وقت بھی شعبۂ اُردو کے کئی اساتذہ سے سلام و نیاز کے خوشگوار مواقع میسر تھے اس لیے ان سے ملاقات میرے لیے باعث مسرت تھی۔ مجھے نہ صرف وہ پہلی ملاقات یاد ہے بلکہ جس خوش اخلاقی سے وہ پیش آئے تھے وہ بھی آج تک یاد ہے۔

اس کے بعد بعض شعری نشستوں میں ان کا کلام سننے کو ملا۔ ان کا کلام تو میں نے زیادہ نہیں سنا کہ شہپر رسول ان شعراء کی قبیل سے تعلق نہیں رکھتے جو لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنا کلام سناتے ہوں یا سننے پر مجبور کرتے ہوں۔ لیکن ان کا جو بھی کلام سنا اچھا لگا۔ مجھے

ان کی شاعری ہمعصر روایتی شاعری سے کچھ مختلف لگی۔ اسی لیے وہ جہاں بھی ملتے میں ان کی شاعری کی ستائش کرتا اور اس بات کا بھی اظہار کرتا کہ عہد حاضر کے شعراء کی بھیڑ میں مجھے ان کا کلام پسند ہے تو کیوں پسند ہے۔ وہ خندہ پیشانی کے ساتھ میرے ستائشی جملے سنتے اور آگے بڑھ جاتے۔

یہ 2010 کی بات ہے۔ ہمارے بڑے بھائی حماد انجم ایڈووکیٹ (مرحوم) کو دہلی کی ایک ادبی تنظیم نے ایوارڈ سے نوازا تو اس موقع پر وہ اپنے عزیز دوست جناب شہرت علی انصاری کے ہمراہ کچھ دنوں کے لیے دہلی تشریف لائے تھے۔ ان کے اعزاز میں خاکسار کی رہائش گاہ پر ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی، ڈاکٹر تابش مہدی، ڈاکٹر کوثر مظہری، جناب ظفر عدیم (مرحوم)، جناب انتظار نعیم اور ڈاکٹر احمد علی برقی سمیت متعدد شعرا نے شرکت کی تھی۔ اس میں پروفیسر شہپر رسول کو میں نے بطور خاص مدعو کیا تھا اور یہ ان کی کرم فرمائی تھی کہ انھوں نے اس بزم میں شرکت کر کے میری عزت افزائی کی۔ یہ ان کا بڑا پن تھا کہ مجھ ناچیز کی دعوت پر وہ غریب خانے پر تشریف لائے اور اپنے معیاری کلام سے سامعین کو محظوظ فرمایا۔ ورنہ ان سے میری ملاقات ایسی نہیں تھی کہ میں ان سے ایک بار درخواست کرتا اور وہ چلے آتے۔ گویا اس طرح انھوں نے اپنی وضعداری کا ثبوت دیا۔

پروفیسر شہپر رسول کو میں قریب سے دیکھ اور جان پاتا اور نہ ہی سمجھ پاتا، اگر دہلی حکومت انھیں دہلی اردو اکادمی کا وائس چیئر مین اور مجھے اس کی گورننگ کونسل کا رکن نامزد نہ کرتی۔ کیونکہ جس طرح میں انھیں سرسری جانتا تھا اسی طرح وہ بھی مجھے بس نام اور شکل سے جانتے تھے۔ ہم دونوں کو کیا پڑی تھی کہ ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل کرتے یا تحقیق کرتے۔ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر، دہلی اردو اکادمی کے سابق وائس چیئر مین، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے سابق ڈائرکٹر اور میرے سابق اور موجودہ کرم فرما پروفیسر خالد محمود صاحب نے جب گورننگ کونسل کے ارکان میں میرا نام دیکھا تو انھوں نے فوری طور پر دو کام کیے۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے مجھے دل کی گہرائیوں سے

مبارکباد پیش کی اور دوسرے یہ کہ شہپر صاحب سے یہ کہتے ہوئے ناچیز کی تعریف کی کہ یہ بڑے کام کے آدمی ہیں اور اکادمی کے ادبی کاموں اور پروگراموں میں ان سے مدد ضرور لیجیے گا کہ "یہی آپ کے کام آئیں گے"۔ اس آخری حصے پر انھوں نے خاصا زور دیا تھا۔ انھوں نے یہ بات میرے سامنے بھی کہی جس پر شہپر صاحب کے لبوں پر ان کا روایتی تبسم کھیل گیا۔ اب پتہ نہیں یہ تبسم طنزیہ تھا، استہزائیہ تھا یا ستائشی۔ یہ تو وہی جانیں۔ لیکن وہ مسکرائے ضرور تھے۔ یہاں میں اس بات کا اعتراف کرنا چاہوں گا کہ پروفیسر خالد محمود کی وائس چیئر مین شپ کے دور میں ہی مجھے دہلی اردو اکادمی کی جانب سے 2013 میں صحافت کا باوقار ایوارڈ حاصل ہوا تھا۔ یہ خالد محمود صاحب کی ذرہ نوازی ہے کہ انھوں نے اس خوشی میں اپنے دولت خانے پر مجھے اور میرے اہل خانہ کو عشائیے پر مدعو کیا۔ دراصل خالد محمود صاحب اور ان کی اہلیہ کو دوست احباب کو کھلانے کے لیے کوئی بہانہ چاہیے۔ اگر بہانہ نہ بھی ملے تو کسی نہ کسی بات کو بہانہ بنانے کا انھیں ملکہ حاصل ہے۔

دہلی اُردو اکادمی کی گورننگ کونسل کی پہلی میٹنگ جو کہ تعارفی تھی، بس تعارف تک محدود رہی۔ ممبران نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا، مل لیے، چائے پی لی اور چلے گئے۔ گویا نشستند و گفتند و برخاستند والا معاملہ رہا۔ لیکن اس کے بعد جب شہپر صاحب کی سربراہی میں اکادمی کا کام آگے بڑھا اور پروگراموں کو ترتیب دینے اور انھیں عملی شکل عطا کرنے کا موقع آیا تو ہم دونوں ایک دوسرے کے کچھ قریب ہوئے۔ دفتر اکادمی کے باہر کے بعض پروگراموں میں بھی ہم دونوں ساتھ ساتھ رہے۔ ان کی قربت نے مجھے انھیں جاننے اور سمجھنے کا موقع عطا کیا اور ان کی بہت سی شخصی خوبیاں میرے سامنے جلوہ گر ہوئیں۔ اب میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ وہ اچھے شاعر ہیں یا اچھے انسان ہیں۔

ان کی شخصیت مجموعۂ اوصاف ہے جس میں شرافت کا عنصر دیگر تمام عناصر پر غالب ہے۔ حالانکہ وہ ایک بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ مردم خیز قصبہ بچھرایوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ خاندانی امیر ہیں۔ روایتی پٹھان ہیں۔ ان کے والد جناب رئیس الدین چودھری متعدد بار اتر پردیش اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ وہ بڑے دبنگ سیاست داں تھے۔

لیکن جب میں نے ان تمام اوصاف کو شہپر رسول کی ذات میں تلاش کرنے کی کوشش کی تو میں ناکام رہا۔ ان کے اندر نہ تو خاندانی تفاخر ہے نہ خاندانی امارت کا رعب جھاڑنے کی عادتِ بد ہے۔ نہ والد کے ممبر اسمبلی رہنے کا زعم ہے اور نہ ہی ان کی ذات میں روایتی پٹھانیت ہے۔ خاندانی تفاخر کو برا سمجھا جا سکتا ہے لیکن اور جو باقی خوبیاں ہیں وہ خوبیاں ہی ہیں خامیاں نہیں۔ لیکن شہپر صاحب کی ذات ان سب سے ماورا ہے۔ اور اس کی بنیادی وجہ قدرت کے ہاتھوں ان کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھر دیا جانے والا شرافت کا مادہ ہے۔

یہ ان کی شرافت ہی ہے کہ وہ بلا ضرورت یا بلا مقصد بلکہ بعض اوقات ضرورت اور مقصد کے تحت بھی خود کو ظاہر نہیں کرتے۔ وہ اپنی شخصیت کو ایک خول میں بند رکھتے ہیں۔ اس خول کو ہٹا پانا آسان نہیں۔ ان کی شخصیت تہ بہ تہ ہے۔ ان تہوں کو آسانی سے کریدا بھی نہیں جا سکتا۔ ہاں جب کوئی ان کی صحبت میں آتا ہے اور ان کے ساتھ کچھ ایام گزارتا ہے تب اس کے سامنے ان کے اوصاف یکے بعد دیگرے کھلتے ہیں۔ وہ بڑے بے نیاز آدمی ہیں۔ اگر کوئی انھیں بہت معمولی آدمی سمجھ رہا ہے تو سمجھا کرے۔ ان کا کیا بگڑتا ہے۔ وہ یہ جتانے اور بتانے کی کوشش نہیں کریں گے کہ تم مجھے چھوٹا کیوں سمجھتے ہو، میں تو بڑے باپ کا بیٹا ہوں اور خود بھی بڑا ہوں۔ یہ ان کی شان بے نیازی ہی ہے جو انھیں تصنع اختیار کرنے سے باز رکھتی ہے۔ تصنع اور بناوٹ سے ان کا دور دور تک کا واسطہ نہیں۔ بلکہ تصنع تو انھیں پسند ہی نہیں ہے۔

پروفیسر شہپر رسول ایک کھرے آدمی ہیں بالکل کھرے سونے کے مانند۔ سونے کا پانی پیتل پر چڑھا کر اسے سونے جیسا تو بنایا جا سکتا ہے لیکن سونے پر کسی اور میٹل کا پانی نہیں چڑھ سکتا۔ بالکل اسی طرح ان کی شخصیت ہے۔ وہ کسی سے غیر ضروری طور پر اثر قبول نہیں کرتے اور نہ ہی مرعوب ہوتے ہیں۔ ان سے سفارش کی بنیاد پر کوئی ایسا کام نہیں کرایا جا سکتا جو وہ کرنا نہ چاہیں۔ جب سے وہ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین کے منصب پر فائز ہوئے ہیں ان کے پاس مشاعروں، سمیناروں، ایوارڈوں اور

دوسرے کاموں کے لیے سفارش کرنے والوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ وہ سفارش کو ناپسند کرتے ہیں۔ اسی طرح جامعہ میں بھی ان سے کوئی ویسا کام نہیں کرایا جا سکتا جس کو وہ ناپسند کرتے ہوں۔ بلکہ اگر کوئی بات ان کے اصولوں کے خلاف ہے تو وہ وائس چانسلر اور رجسٹرار تک کی بات ٹال دیتے ہیں اور اگر کچھ نہیں تو کم از کم فیصلے پر اپنی عدم رضامندی ظاہر کر دیتے ہیں۔

ان کی ذات جیسی باہر ہے ویسی ہی اندر ہے۔ قول و فعل میں کوئی تضاد نہیں۔ جو دل میں ہے وہی زبان پر ہے۔ ایک سچے انسان کی بلکہ ایک سچے مومن کی یہی پہچان ہوتی ہے کہ وہ اندر باہر ایک جیسا ہو۔ زبان سے وہی کہے جو اس کے دل میں ہو۔ کوئی بھی سچی بات کہنے سے گھبرائے نہ کسی مصلحت کو آڑے آنے دے۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو۔ شہپر صاحب مصلحت کوش نہیں ہیں۔ کسی بھی معاملے میں اپنی بے لاگ رائے رکھتے ہیں اور اس کا برملا اظہار بھی کرتے ہیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں کہ ان کی کوئی بات ان کے مخاطب کو ناگوار گزر سکتی ہے۔ وہ ہر معاملے میں معیار کو پسند کرتے ہیں۔ غیر معیاری چیزیں انھیں ناپسند ہیں۔ خواہ وہ طرز زندگی ہو یا شاعری، یا حلقۂ احباب۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا شہپر رسول کی شخصیت ایک دو ملاقاتوں میں نہیں کھلتی۔ وہ اس کے قائل ہی نہیں ہیں کہ اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے قائل ہیں کہ اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں۔ ان کو جاننے کے لیے دو چار ملاقاتیں بے حد کم ہیں۔ دو چار سو ملاقاتوں میں جا کر کوئی ان کو پوری طرح سمجھ پاتا ہے۔ لہٰذا میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں ان کو پوری طرح سمجھتا ہوں۔ اب بھی میرے اور ان کے درمیان تکلفات کے کئی دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اب انھوں نے باہمی رشتوں کے درمیان حائل رہنے والے کئی پردے چاک کر دیے ہیں۔

پہلی بار ان سے ملنے والا شخص ان کو انتہائی خشک تصور کرتا ہے اور وہ اس میں حق بجانب بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ پہلی ملاقات میں وہ ایسی گفتگو ہی نہیں کرتے جو حد ادب عبور

کرنے کے لیے مخاطب کی حوصلہ افزائی کرے۔ نہ ہی ایسی گفتگو کرتے ہیں کہ ان کی شخصیت کا کوئی پہلو بے نقاب ہو جائے۔ پہلی بار ان سے ملنے والا اگر وہ کسی ضرورت کے تحت ملتا ہے تو ڈرا ڈرا سا رہتا ہے اور سوچتا ہے کہ پتہ نہیں ان کا جواب کیا ہوگا۔ جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا کہ چونکہ وہ انتہائی کھرے اور سچے آدمی ہیں اس لیے کسی کو خوش گمانی میں بھی نہیں رکھتے۔ بلکہ جو بات بھی ان کو کہنی ہوتی ہے صاف صاف اور بلا جھجک کہہ دیتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ان کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا کہ سامنے والا ان کے بارے میں کیا تاثر لے گا۔ ان کو اس کی فکر بھی نہیں ہوتی کہ کہیں ان کی باتیں اس شخص کو ان سے بدگمان نہ کر دیں۔ اگر کوئی بدگمان ہوتا ہے تو ہوتا رہے، ان کی بلا سے۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر وہ کسی کی فرمائش یا ضرورت پوری کرنے کی پوزیشن میں ہوتے ہیں اور وہ فرمائش ان کے مزاج اور اصولوں کے خلاف نہیں ہے تو ضرور پوری کرتے ہیں لیکن اس صورت میں بھی وہ ایسے رویے کا مظاہرہ نہیں کرتے کہ ضرورت مند بہت زیادہ خوش ہو جائے۔ بلکہ وہ اپنے چہرے پر کوئی تاثر ہی نہیں آنے دیتے اور اس کو ایک غیر یقینی کی کیفیت میں مبتلا کیے رکھتے ہیں۔

جب انھیں دہلی اردو اکادمی کا وائس چیئرمین اور مجھے گورننگ کونسل کا رکن نامزد کیا گیا تو میں نے ان سے دیرینہ شناسائی کی روشنی میں یہ خوش فہمی پال لی کہ میں اکادمی کے کاموں کے سلسلے میں ان کے سامنے جو بھی تجویز رکھوں گا وہ اسے من وعن تسلیم کر لیں گے۔ لہٰذا جب لال قلعہ کے مشاعرے کا پہلا موقع آیا تو میں نے اپنے ایک شناسا شاعر کے لیے جنھوں نے بذریعہ فون مجھے تنگ کر رکھا تھا، سفارش کی کہ وہ انھیں اس مشاعرے میں پڑھوائیں تا کہ ان سے میں اپنا دامن چھڑا سکوں۔ لیکن انھوں نے نہایت بے مروتی کے ساتھ کہا کہ ''ارے صاحب شعراء کی فہرست تو مکمل ہو چکی ہے۔ وہ دہلی کے نائب وزیر اعلیٰ جناب منیش سسودیا پہلے ہی فائنل کر چکے ہیں اور یہ کہ اس بار سے یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ شعراء کی بہت زیادہ بھیڑ نہ ہو کہ مشاعرے میں فجر کا وقت ہو جائے۔ کم رکھے جائیں لیکن اچھے رکھے جائیں''۔ اچھا ہوا انھوں نے صاف صاف کہہ دیا۔ کیونکہ اس

طرح میں نے شاعر صاحب کی گرفت سے خود کو چھڑا لیا۔ اس کے بعد میں نے کسی بھی کام کے لیے ان کے سامنے کوئی تجویز نہیں رکھی۔ شاید اس وقت تک ان کو بھی میرے مزاج سے کوئی واقفیت نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ جب ملاقاتیں بڑھنے لگیں تو دونوں نے ایک دوسرے کو کچھ سمجھا کچھ جانا۔ لہٰذا دوسرے یا تیسرے سال کے لال قلعہ کے مشاعرے کی فہرست میں میں نے دیکھا کہ مذکورہ شاعر صاحب کا بھی نام شامل ہے۔ لیکن میں نے اس واقعہ کے بعد کسی بھی کام کے لیے کوئی سفارش نہیں کی۔ البتہ ایوارڈ کمیٹی اور ایگزیکٹو کمیٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے کمیٹی کی میٹنگوں میں اگر کوئی ضرورت ہوتی اور میں مناسب سمجھتا تو مشورہ ضرور دیتا اور مجھے خوشی ہے کہ اکادمی کے ذمہ داران اور خود شہپر صاحب نے میرے ایسے کسی بھی مشورے کو رد نہیں کیا۔

پروفیسر شہپر رسول کی دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین کی حیثیت سے یہ کوشش رہی ہے کہ اکادمی میں اردو کے فروغ کا کام ہو۔ اس بارے میں انھوں نے بڑی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ اکادمی کے کاموں کے لیے ماہرین کی ضرورت پڑی اور اکادمی میں ویسے لوگ نہیں ملے تو شہپر صاحب جامعہ سے کسی نہ کسی ماہر یعنی ایکسپرٹ کو ساتھ لے جاتے تھے۔ چونکہ ہم دونوں جامعہ نگر کے علاقے میں رہتے ہیں اس لیے عموماً ایسا ہوتا کہ اکادمی کی میٹنگوں میں یا اس کے پروگراموں میں یا سمیناروں میں شرکت کے لیے ہم دونوں ساتھ جاتے۔ میرے لیے یہ سہولت ہو جاتی کہ مجھے ان کی گاڑی میں بیٹھنے اور ان سے گفتگو کا موقع مل جاتا اور انھیں ایک ہمسفر مل جاتا۔ ساتھ نہ جانے کا واقعہ بس ایک دو بار ہی ہوا ہوگا وہ بھی اس وقت جب وہ پہلے سے ہی کسی مصروفیت کی وجہ سے گھر سے باہر رہے ہوں۔ ایسے ہر سفر میں میں نے دیکھا کہ شہپر صاحب ہی گفتگو کا آغاز کرتے۔ میں تو اس لحاظ میں رہتا کہ پتہ نہیں میری گفتگو ان کو اس وقت پسند آئے گی یا نہیں۔

دہلی اُردو اکادمی کی جانب سے ہر سال ثقافتی میلے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ پہلے یہ میلہ لال قلعہ کے سبزہ زار پر لگتا تھا۔ مگر اب جبکہ دہلی میں عام آدمی پارٹی کی حکومت آئی

تو نائب وزیر اعلیٰ منیش سسودیا کی دلچسپی کی بنا پر یہ ثقافتی میلہ کناٹ پلیس کے سینٹرل پارک میں منعقد کیا جانے لگا۔ منیش سسودیا ریختہ کے جشن اردو سے بہت متاثر ہیں۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ اس کے پائے کا ثقافتی میلہ لگنا چاہیے۔ لیکن چونکہ ریختہ ایک غیر سرکاری اور دہلی اردو اکادمی ایک سرکار کے تحت چلنے والا ادارہ ہے اس لیے دونوں میں فرق ہے۔ اردو اکادمی کی کچھ مجبوریاں ہیں۔ لہٰذا ریختہ کے پائے کا پروگرام وہ تو نہیں کر سکتی البتہ کچھ اسی قسم کے پروگرام کی خواہش ضرور رکھتی ہے۔ چنانچہ دہلی حکومت بالخصوص منیش سسودیا کی دلچسپی سے وہ میلہ کناٹ پلیس میں لگنے لگا۔ اکادمی کے ذمہ داران اور کارکن انتہائی محنت سے اسے ترتیب دیتے ہیں اور وہ ایک الگ قسم کا ادبی وثقافتی میلہ سا بن گیا ہے۔ جس میں متنوع پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ اس میں آخری شب میں مشاعرے کا اہتمام ہوتا ہے۔ ایک سال مشاعرے میں میں نے بھی سامع کی حیثیت سے شرکت کی۔ اتفاق سے میں شہپر رسول اور خالد محمود صاحبان کے ساتھ صف سامعین میں بیٹھا تھا۔ مشاعرے میں پڑھے جانے والے اشعار پر ہم لوگ دبی دبی زبان میں تبصرے بھی کرتے جاتے تھے۔ خالد محمود صاحب نہ صرف یہ کہ ایک بزلہ سنج آدمی ہیں بلکہ حاضر جواب اور فقرہ باز بھی ہیں۔ اس موقع پر بھی وہ خوب فقرے کستے رہے۔ میں بھی اپنی پسند وناپسند کے مطابق کچھ بول دیا کرتا۔ جب کافی دیر ہوگئی اور میرا تبصرہ جاری رہا تو دونوں حضرات کسی حد تک چونکے۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ ارے یار تم تو بڑا اچھا شعری ذوق رکھتے ہو۔ اچھے اور خراب شعر کی خوب پہچان ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب آپ لوگ اب شاعری کر رہے ہیں اور میں نے شاعری کر کے چھوڑ دی ہے۔ یہ بات درست بھی ہے۔ میں نے عنفوان شباب میں کم از کم دس بارہ سال تک شاعری کی ہے۔ لیکن پھر اچانک آمد بند ہوگئی۔ آورد کے سہارے کب تک شاعری کی جا سکتی۔ لہٰذا میں نے شاعری ترک کر کے اپنی پوری توجہ صحافت پر مبذول کر دی۔ بہر حال ان کے دور میں اکادمی میں کافی کام ہوا لیکن چونکہ وہ پروپیگنڈے کے آدمی نہیں ہیں اس لیے ان کاموں کی تشہیر نہیں ہوئی اور کچھ لوگ ان کے بارے میں اپنے دل میں یہ بدگمانی پالے

ہوئے ہیں کہ شہپر رسول صاحب نے کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن اس سے ان کی ذات پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر کچھ لوگ ان کے بارے میں ایسی رائے رکھتے ہیں تو رکھتے رہیں۔ ان کی بلا سے۔

دوسرے لوگوں کے مانند شہپر صاحب بھی میرے بارے میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ میں کسی بھی موضوع پر لکھ سکتا ہوں اور کبھی بھی لکھ سکتا ہوں۔ وہ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ کوئی سیاسی موضوع ہو یا ادبی سہیل انجم کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔ ایک بار اردو اکادمی کے رسالہ ''ایوان اردو'' کا ایک شخصیت پر جن کا حال ہی میں انتقال ہوا تھا، خصوصی شمارہ نکلنا تھا۔ ایک مضمون کی کمی تھی۔ اکادمی کے ذمہ داروں نے شہپر صاحب سے کہا۔ انھوں نے کہا کہ اچھا میں ابھی انتظام کرتا ہوں۔ بس انھوں نے مجھے فون کر کے کہا کہ ایوان اردو کے لیے فلاں صاحب پر ایک مضمون چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ ڈاکٹر صاحب میں ان کو زیادہ نہیں جانتا اور وقت بھی کم ہے اور میری مصروفیت زیادہ ہے۔ میں نہیں لکھ سکتا۔ کہنے لگے ارے تمھارے لیے کیا مشکل ہے۔ تم نے جہاں قلم اٹھایا وہیں مضمون تیار ہو گیا۔ میں نے کہا کہ اللہ کی پناہ میرے بارے میں ان کو ایسی خوش فہمی ہے۔ چونکہ میں نہیں لکھ سکتا تھا اس لیے میں نے مضمون نہیں لکھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ اب بھی میرے بارے میں اسی حسن ظن میں مبتلا ہیں۔

نومبر 2020

ڈاکٹر سید احمد خاں

عالمی یوم اُردو کا بانی

ڈاکٹر سید احمد خاں کی شخصیت مجموعۂ اضداد ہے جس میں بیتابی بھی ہے اور انہماک بھی ہے۔ عجلت پسندی بھی ہے اور مستقل مزاجی بھی ہے۔ عجلت پسندی ایسی کہ فٹا فٹ پروگرام ترتیب دے دیتے ہیں اور مستقل مزاجی ایسی کہ 9 رنومبر رمضان میں پڑے یا عید بقرعید پر، منائیں گے اسی روز۔ ان کی یہ دونوں عادتیں ان کی خوبیاں بھی ہیں کہ جب تک کوئی پروگرام ترتیب نہ دیا جائے اس پر عمل آوری نہیں ہوسکتی اور مستقل مزاجی اپنے کاز کے تئیں انسان کے والہانہ لگاؤ اور خود سپردگی کی علامت اور ثبوت ہے۔ ان کی جذباتی وابستگی علوم طب سے بھی ہے اور اردو زبان سے بھی ہے یہ دونوں کے عاشق ہیں۔ جبھی تو آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے معاملات میں سرگرم رہتے ہیں اور اردو کے محاذ پر بھی آلاتِ حرب وضرب سے لیس ہوکر موجود رہتے ہیں۔

ڈاکٹر سید احمد خاں نے اردو سے اپنے عشق اور محبت کو عملی جامہ پہنانے کے لیے 1997 میں یوم اردو کے نام سے ایک پروگرام کی بنیاد ڈالی تھی جو بعد میں عالمی یوم اُردو میں تبدیل ہوگیا۔ انھوں نے جو چراغ جلایا تھا اس کی روشنی قریہ در قریہ اور علاقہ در علاقہ اور یہاں تک کہ ملک در ملک پھیلتی رہی اور محبان اردو اس چراغ سے چراغ جلاتے رہے۔ یہ پروگرام علامہ اقبال کے یوم پیدائش پر یعنی 9 رنومبر کو منعقد کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں اور قصبوں میں تو یوم اردو منایا ہی جاتا ہے دنیا کے ان ملکوں

میں بھی منایا جانے لگا ہے جہاں اردو والے موجود ہیں۔ اس دن یہ عہد کیا جاتا ہے کہ ہم اُردو کی بقا اور اس کے تحفظ کی لڑائی جاری رکھیں گے اور خود بھی اردو پڑھیں گے اور اپنے بچوں کو بھی پڑھائیں گے۔ دینا بھر سے جو رپورٹیں آتی ہیں اور لوگوں کے خطوط موصول ہوتے ہیں وہ اس بات کے شاہد ہیں کہ یوم اردو کا جو چراغ ڈاکٹر سید احمد خاں نے جلایا تھا اس کا اجالا اب دور دور تک پھیل گیا ہے۔ اردو دشمنی کی تاریکی چھٹ رہی ہے اور پیار محبت کی روشنی پھیل رہی ہے۔

ڈاکٹر سید احمد خاں کا اس بارے میں کہنا ہے کہ جب انھوں نے اس مہم کا آغاز کیا تھا تو ان کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اردو سے محبت کرنے والے ان کی اس چھوٹی سی کوشش کی اتنی پذیرائی اور وہ بھی عملی پذیرائی کریں گے۔ کچھ لوگوں نے ان سے سوال کیا تھا کہ آپ کی یہ مہم کیا کوئی رنگ لا سکتی ہے اور یہ کہ جب کوئی کچھ نہیں کر رہا ہے اور اردو کے تعلق سے اردو والوں پر بھی جمود طاری ہے تو آپ کیوں خواہ مخواہ اپنا سر کھپا رہے ہیں؟ اس پر انھوں نے جواب دیا تھا کہ میں نے ایک ننھا سا چراغ جلایا ہے اگر اس چراغ کی لو سے دوسرے لوگ بھی اپنا چراغ جلاتے ہیں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ اور اگر نہیں جلاتے ہیں تو کوئی بات نہیں۔ ان کا جو کام ہے وہ اہلِ سیاست جانیں، میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے۔ میں محبت کے اس پیغام کو عام کرنے کی جد و جہد جاری رکھوں گا۔ اگر مخالفین زمانہ کی تند و تیز آندھیاں اس چراغ کو بجھانا چاہیں تو بجھائیں، لیکن میں اس کے بعد ہی دوسرا چراغ جلانا نہیں بھولوں گا۔ ان کے بقول میں نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ خواہ کچھ ہو جائے میں یوم اردو منانے کا سلسلہ بند نہیں کروں گا۔ کوئی ساتھ آئے یا نہ آئے۔ اگر کوئی ساتھ آتا ہے تو مجھے خوشی ہوگی اور اسے بھی اس قافلے میں شامل کر لیا جائے گا اور اگر کوئی نہیں بھی آتا ہے تب بھی یہ قافلہ رواں دواں رہے گا۔ چاہے اس میں صرف میں ہی اکیلا کیوں نہ رہوں۔ ڈاکٹر سید احمد خاں نے اس شعر کے مصداق کہ:

شکوۂ ظلمت شب سے تو کہیں بہتر ہے
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

ظلمت شب کا شکوہ کرنے کے بجائے اس سے لڑنے کے لیے ایک شمع جلائی تھی اور آج بے شمار ہاتھ ان کے ساتھ آگئے ہیں جو اس شمع سے اپنی شمع جلا رہے ہیں۔ یہ سلسلہ انھوں نے نامساعد حالات میں بھی جاری رکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کے نزدیک اردو کی بقا کا سوال تھا، اس کے تحفظ کا سوال تھا اور اس کو اس کا جائز حق دلانے کا سوال تھا۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم کہ میری کوششوں سے کوئی فائدہ پہنچا یا نہیں؟ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ میرے ایک چراغ کے جلو میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں چراغ جل اٹھے ہیں اور میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے جو کوشش شروع کی تھی وہ رائگاں نہیں گئی۔ اسے لوگوں نے شرف قبولیت سے نوازا ہے۔ سچ بات یہ ہے کہ منزل کی طرف قدم بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر جذبہ صادق ہو اور نیت میں خلوص ہو تو بے شمار لوگ قافلے میں شامل ہو جاتے ہیں اور منظر نامہ یوں ترتیب پاتا ہے کہ:

میں اکیلا ہی چلا تھا جانب منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا

ڈاکٹر سید احمد خاں نے تن تنہا اپنا سفر شروع کیا تھا لیکن آج وہ ایک بہت بڑے قافلے کے سالار اور قائد ہیں۔

ان کے اندر بہت سی خوبیاں ہیں۔ وہ اُردو دوست تو ہیں ہی انسانیت نواز بھی ہیں۔ ان کی اس خوبی کا مشاہدہ کرنا ہو تو ان کے چیمبر میں جائیں جہاں مریضوں کا بے انتہا رش رہتا ہے۔ کوئی بھی مریض کسی دوسرے ڈاکٹر سے علاج کرانا نہیں چاہتا۔ ہر مریض کی خواہش ہوتی ہے کہ سید صاحب اس کی نبض پر اپنی انگلی رکھیں اور اس کے لیے نسخہ تجویز کریں۔ میں نے سید صاحب کے ایک بہت ہی مخلص اور قریبی دوست سے اس کی وجہ معلوم کرنی چاہی تو انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا کہ اس میں ان کی مسیحائی کا دخل ہو یا نہ ہو البتہ ان کے حسن سلوک کا کہیں زیادہ عمل دخل ہے۔ وہ مریضوں سے جس محبت آمیز انداز میں گفتگو کرتے ہیں وہ خود مسیحائی کا کام کرتا ہے اور نصف بیماری ان کی شیریں زبانی سے ہی دور ہو جاتی ہے۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ جس روز ان کی او پی ڈی نہیں

ہوتی یعنی مریض دیکھنے کی ڈیوٹی نہیں ہوتی اس روز بھی ان کے پاس اتنے مریض آتے ہیں کہ انکار کرنے کے باوجود وہ اتنے مریضوں کو دیکھ لیتے ہیں جتنے دوسرے ڈیوٹی کے دن بھی نہیں دیکھتے۔

ان کا جذبۂ ہمدردی وانسانیت نوازی یہیں تک محدود نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے رہائشی علاقے میں بھی ایک دواخانہ کھول رکھا ہے جہاں ''نو پرافٹ نو لاس'' پر مریضوں کو دوائیں دی جاتی ہیں۔ وہ دواخانہ، شفاخانہ بھی ہے اور کوچۂ جاناناں بھی، کہ ان کے بہت سے عاشق اور مداح وہیں جا کر ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرتے ہیں اور لطف صحبت اٹھاتے ہیں۔ یہ اگر چاہیں تو بہت کچھ کما سکتے ہیں لیکن ان کے نزدیک اہمیت دنیاوی اور مادی کمائی کی نہیں بلکہ آخرت کی کمائی کی ہے۔ اسی لیے ان کا دھیان پیسہ بٹورنے پر نہیں رہتا۔ بہت سی کمپنیوں کے نمائندے ان کے پاس آتے ہیں اور بھاری کمیشن پر ''ناٹ فار سیل'' والی ادویات دیتے ہیں اور ان سے انھیں فروخت کرنے کی پیشکش کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یہ سختی سے بھگا دیتے ہیں۔ البتہ جو نمائندے ایسی کسی پیشکش کے بغیر ان کے پاس دوائیں چھوڑ جاتے ہیں ان کو یہ ضرورت مندوں میں مفت تقسیم کر دیتے ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ کچھ ایسے لوگوں کو جن کو یہ زیادہ معزز سمجھتے ہیں پرچہ بنوانے یا دوا لینے کی لائن میں نہیں لگنے دیتے بلکہ کسی چپراسی کو بلا کر اس سے یہ کام نکال لیتے ہیں۔

(ایک تقریب میں پڑھا گیا مضمون)

جنوری 2014

○○

محمد اویس سنبھلی

ادیب بھی ادیب نواز بھی

جن لوگوں کا ذریعہ معاش ہی لکھنا پڑھنا ہو ان کی تصنیفی خدمات کی میرے نزدیک اتنی اہمیت نہیں جتنی کہ ان لوگوں کی تصنیفی خدمات کی ہے جو شوق اور دلچسپی کی وجہ سے یہ کام کرتے ہوں۔ علمی دنیا میں ایسے لوگوں کی خاصی تعداد ہے جن کی پیشہ ورانہ مشغولیات غیر ادبی وغیر صحافتی ہونے کے باوجود وہ نہ صرف یہ کہ اچھے مضمون نگار ہیں بلکہ اچھے ادیب اور نقاد بھی ہیں۔ ایسے لوگوں میں اعلیٰ پائے کے متعدد ادیب و نقاد گزرے ہیں اور ان کی ادبی خدمات دوسروں سے کم نہیں۔ سرزمین سنبھل پر پیدا ہونے والے اور سرزمین لکھنؤ کو اپنا میدان عمل بنانے والے نوجوان ادیب، مصنف، مؤلف اور مرتب اویس سنبھلی کو میں اسی قطار میں رکھتا ہوں۔ اگرچہ ان کی پیشہ ورانہ سرگرمیاں وہ نہیں ہیں جو جامعات کے اردو شعبوں کے اساتذہ کی یا اخبارات میں صحافت کرنے والوں کی ہوتی ہیں تاہم وہ ایک معیاری ادبی ذوق رکھتے ہیں اور اس ذوق کی آبیاری کے لیے ہمیشہ سرگرم عمل بھی رہتے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی وہ نصف درجن سے زائد کتابیں ہیں جو شائع ہو کر ارباب علم ودانش سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

چونکہ وہ ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے اعلیٰ ادبی ذوق ان کے خون میں شامل ہے۔ وہ جناب نظیف الرحمٰن سنبھلی کے صاحبزادے اور ملک کے معروف عالم دین حضرت مولانا محمد منظور نعمانی کے نواسے اور جید صحافی و ادیب جناب

حفیظ نعمانی کے بھانجے ہیں۔ حفیظ نعمانی کی سرپرستی نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ ان کے علاوہ مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور مولانا خلیل الرحمٰن سجاد نعمانی سے بھی انھوں نے کسب فیض کیا کہ وہ دونوں بھی ان کے ماموں جو ٹھہرے۔ گویا اویس سنبھلی کے اس علمی ذوق و شوق میں ان کا خاندانی پس منظر اور مولانا محمد منظور نعمانی اور ان کے صاحبزادگان کی علمی وراثت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ مولانا محمد منظور نعمانی کی دینی و علمی خدمات سے کون واقف نہیں اور پھر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کی علمیت اور حفیظ نعمانی کی علمیت کے ساتھ ساتھ جرأت و ہمت سے ایک زمانہ واقف ہے۔ ان بزرگان علم و داب کے سائے میں پروان چڑھنے والے اویس سنبھلی اگر علمی ذوق و شوق نہ رکھتے تو یہ خسارے کی بات ہوتی۔

کئی سال پہلے کی بات ہے۔ اویس سنبھلی سے تعارف اور ملاقات سے قبل جناب حفیظ نعمانی سے بذریعہ فون گفتگو ہوتی رہی ہے۔ یہ گفتگو ان کے مضامین کے حوالے سے ہوتی۔ اویس سنبھلی سے بھی فون پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی درمیان مجھے لکھنؤ جانا ہوا اور حفیظ صاحب کے ہوٹل ''رِداکانٹی ننٹل'' میں میرا قیام ہوا۔ اویس سنبھلی کو معلوم ہوا تو وہ ملاقات کی غرض سے ہوٹل آئے۔ اس طرح ان سے میری پہلی باضابطہ ملاقات اسی ہوٹل میں ہوئی۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میں حفیظ صاحب سے ملاقات کرنے ان کے دولت کدے پر جانے والا ہوں اور میرے ساتھ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے لکھنؤ کیمپس میں استاد ڈاکٹر عمیر منظر بھی ہوں گے تو انھوں نے عمیر منظر سے کہہ دیا کہ وہ حفیظ صاحب کی دونوں کتابیں ''بجھے دیوں کی قطار'' اور ''رودادِ قفس'' دلوانا نہ بھولیں۔ اس ملاقات میں اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا لکھنؤ کے کارکن اور ہمارے دوست سمیع اللہ قمر بھی ساتھ تھے۔ حفیظ صاحب نے یہ دونوں کتابیں عنایت کیں۔ اوّل الذکر کتاب کچھ سرکردہ مرحومین کے خاکوں پر مشتمل ہے تو ثانی الذکر ان کی نو ماہ کی جیل کی روداد ہے۔ میں نے ان دونوں کتابوں کے حوالے اور ان سے ہونے والی ملاقات کے ذکر کے ساتھ ایک طویل مضمون لکھا جو لکھنؤ کے روزنامہ ''اودھ نامہ'' میں شائع ہوا۔ اس مضمون کا اویس سنبھلی پر جانے کیا اثر ہوا کہ وہ مجھ سے بڑی محبت کرنے لگے۔ لہٰذا جب

انھوں نے لکھنؤ میں اپنی کتاب ''قلم کا سپاہی: حفیظ نعمانی'' کے اجرا کا پروگرام ترتیب دیا تو خاکسار کو انھوں نے بطور مہمان اعزازی مدعو کیا۔ اس پروگرام میں ممبئی کے معروف صحافی، شاعر اور ادیب ندیم صدیقی کے علاوہ بزرگ صحافی جناب عالم نقوی اور دوسری اہم شخصیات کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ پروگرام کی نظامت جہاں ملک کے معروف ناظم انور جلالپوری نے کی وہیں صدارت کے فرائض معروف ادیب ونقاد پروفیسر شارب ردولوی نے انجام دیے۔ لکھنؤ میں منعقد ہونے والا یہ پروگرام اس لحاظ سے میرے لیے یادگار تھا کہ اس میں لکھنؤ کے نامی گرامی ارباب علم و دانش موجود تھے جن کو پہلی بار سننے کا مجھے شرف حاصل ہوا۔ جناب حفیظ نعمانی اس پروگرام میں شرکت کے لیے قطعی تیار نہیں تھے۔ ان کی دلیل تھی کہ ہر مقرر ان کی تعریف کرے گا اور یہ اچھا نہیں لگے گا کہ میں وہاں بیٹھ کر اپنی تعریف کرواؤں اور سنوں۔ لیکن خاص طور پر ندیم صدیقی اور خاکسار کے اسرار پر انھوں نے اس پروگرام میں شرکت پر آمادگی ظاہر کی۔ لیکن پورے پروگرام کے دوران وہ سر جھکائے ایسے بیٹھے رہے جیسے ان کی تعریف کے بجائے ان پر الزامات کی بارش کی جارہی ہو۔

اسی موقع پر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ پروگرام کے بعد حفیظ صاحب کے دولت کدے پر مولانا ایک کرسی پر تشریف فرما تھے۔ میں نے جا کر ان سے سلام کیا اور انھیں اپنا نام بتایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ آپ کے نام سے تو ایک زمانے سے واقف ہوں لیکن ملاقات پہلی بار ہورہی ہے۔ اس کے بعد تو وہ مجھ سے بڑی محبت کرنے لگے۔ بلکہ کسی حد تک ان سے میری بے تکلفی بھی ہوگئی۔ اس موقع پر میری موجودگی میں جن سے ان کی ملاقات ہوتی وہ میری طرف اشارہ کرکے کہتے کہ یہ میری نئی دریافت ہیں۔ ان کے بیٹے عبید صاحب جنوبی دہلی میں مالویہ نگر کے حوض رانی علاقے میں رہتے ہیں۔ جب بھی مولانا ان کے پاس آتے تو مجھے یاد فرماتے اور میں ان سے شرف نیاز کے لیے حاضر ہوجاتا۔ انھوں نے اپنی کئی تصنیفات مجھے تحفتہً عنایت کیں جن میں خاص تحفہ قرآن مجید کی ان کی تشریح تھی جو کئی جلدوں میں ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ لندن میں گزارا تھا۔ اس پہلی ملاقات کے بعد

جب وہ لندن گئے تو تقریباً ہر ہفتے ان کا ای میل آتا اور وہ میری خیریت دریافت کرتے۔ میں اس علمی شخصیت سے شرف نیاز حاصل ہونے کا کریڈٹ اویس سنبھلی کو دیتا ہوں کہ اگر انھوں نے اپنے پروگرام میں مجھے مدعو نہیں کیا ہوتا تو میں ایک بڑی اہم علمی شخصیت کی صحبت سے محروم رہ جاتا۔

اویس سنبھلی ایک انتہائی متحرک اور سرگرم شخصیت کا نام ہے۔ وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات میں سے جانے کیسے اتنا وقت نکال لیتے ہیں کہ علمی و ادبی کام بھی کر ڈالتے ہیں۔ اب تک ان کی آٹھ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ ہیں: فکر و احساس کی قندیلیں (نظیف الرحمٰن سنبھلی کے مضامین کا مجموعہ)، اعتراف سعادت (ڈاکٹر سعادت علی صدیقی کی حیات و خدمات پر مشتمل مضامین کا مجموعہ)، کاوشیں (مجموعہ مضامین)، بجھے دیوں کی قطار (حفیظ نعمانی کے خاکوں سے انتخاب)، قلم کا سپاہی: حفیظ نعمانی (حفیظ نعمانی کی حیات و خدمات پر مشتمل مضامین)، باغ سنبھلی کی شعری کائنات (حضرت داغ دہلوی کے جانشین، محمد فضل رب باغ سنبھلی کا غیر مطبوعہ کلام)، افسانوی ادب اور حیات اللہ انصاری (حیات اللہ انصاری کے افسانوی ادب پر مشتمل مقالات کا مجموعہ)، نذر شارب (پروفیسر شارب ردولوی کے علمی و ادبی کارناموں پر مشتمل مضامین کا مجموعہ) اور حفیظ نعمانی: ایک عہد ایک تاریخ۔

اس فہرست کو دیکھ کر کوئی بھی شخص اویس سنبھلی کے ستھرے علمی و ادبی ذوق کا اندازہ لگا سکتا ہے۔ ان میں تین کتابیں حفیظ نعمانی سے متعلق ہیں جس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انھیں حفیظ صاحب سے بڑی محبت و عقیدت ہے۔ حالانکہ حفیظ صاحب جیسی ریا و نمود سے دور رہنے والی شخصیت کے مضامین کا مجموعہ تیار کرنا ہو یا ان کے اوپر مضامین یکجا کرنا، یہ کام اس لیے مشکل تھا کہ حفیظ صاحب اس کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ جب بھی اویس سنبھلی اس سلسلے میں ان سے گفتگو کرتے یا صلاح و مشورہ کرتے تو وہ یہ کہہ کر ٹال جاتے کہ ارے میری کیا حیثیت ہے اور میرے مضامین کی کیا وقعت ہے۔ جب اویس سنبھلی نے حفیظ صاحب کے شخصی مضامین کو یکجا کرنے کے بعد ان سے انتخاب کی کوشش کی تو

حفیظ صاحب نے ان کی بڑی حوصلہ شکنی کی۔ وہ یہ کہہ کہہ کر اپنے مضامین کو الگ تھلگ کر دیا کرتے تھے کہ ارے یہ بیکار ہے، ارے اس میں کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن اویس بھی ہار ماننے والے نہیں تھے۔ انھوں نے اس وقت تک حفیظ صاحب کا دامن نہیں چھوڑا جب تک کہ وہ اس کے لیے آمادہ نہیں ہو گئے۔ ایسا نہیں ہے کہ حفیظ صاحب اویس سنبھلی کی صلاحیتوں سے واقف نہیں تھے۔ وہ بالکل واقف تھے اور جانتے تھے کہ ان کے ذوق کا معیار کافی بلند ہے۔ کیونکہ اس سے قبل ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آچکی تھیں۔ لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ کوئی شخص کوئی ایسا کام کرے جس میں ان کی تعریف کا پہلو نکلتا ہو۔ بہرحال اویس سنبھلی نے حفیظ صاحب کے متعدد مضامین میں سے ایک خوبصورت انتخاب کیا اور اس طرح وہ کتاب 2012 میں چھپ کر منظر عام پر آگئی۔ بلا شبہ یہ ایک انتہائی عمدہ، دلچسپ اور معلوماتی کتاب اور ادب کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اگر یہ کتاب شائع نہ ہوئی ہوتی تو ادبی دنیا کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی ہوتی۔ کیونکہ اس میں جو خاکے ہیں وہ انتہائی اہم شخصیات پر ہیں۔ وہ ایک طرح سے ایک تاریخی کتاب بھی ہے۔ انھوں نے کچھ ایسے لوگوں پر بھی خاکے لکھے ہیں کہ اگر وہ نہ لکھتے تو بہت سی باتیں مخفی رہ جاتیں اور ادبی دنیا ان سے واقف نہیں ہو پاتی۔ حفیظ صاحب پر اویس سنبھلی کی دوسری کتاب ''قلم کا سپاہی: حفیظ نعمانی'' ہے۔ اس میں مختلف قلمکاروں کے حفیظ صاحب پر مضامین ہیں اور تقریباً تمام مضامین حفیظ صاحب کی صحافت، ان کی جرأتمندی اور ان کی بیباکی و بے خوفی کو محیط ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ان کی زندگی میں شائع ہوئی تھیں۔ البتہ تیسری کتاب ''حفیظ نعمانی: ایک عہد ایک تاریخ'' ان کی وفات کے بعد منظرِ عام پر آئی۔ اس میں بھی بے شمار قلمکاروں کے مضامین ہیں جن میں حفیظ نعمانی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے اور ان کی صحافتی، علمی و ادبی خدمات اور ان کی جرأتمندی و بیباکی کا اعتراف کیا گیا ہے۔

اہلِ علم نے اویس سنبھلی کی ان علمی و ادبی کاوشوں کی خوب ستائش کی۔ ایسے لوگوں میں اردو ادب کی ایک بڑی شخصیت شمس الرحمٰن فاروقی بھی شامل ہیں۔ اویس

سنبھلی نے جب اعتراف سعادت اور بجھے دیوں کی قطار شمس الرحمٰن فاروقی کی خدمت میں ارسال کی تو انھوں نے ان الفاظ میں اس کی رسید دی: ''برادرم جناب محمد اویس سنبھلی، السلام علیکم۔ آپ کی مرسلہ دونوں کتابیں اعتراف سعادت اور بجھے دیوں کی قطار، ملیں۔ بہت بہت شکریہ۔ دونوں کتابوں کو میں نے توجہ سے دیکھا۔ سعادت علی صدیقی مرحوم پر آپ نے کتاب اچھی مرتب کی۔ سعادت علی صدیقی اردو کے بہت بڑے خدمت گزار تھے۔ ان کے کارناموں کا جتنا اعتراف کیا جائے کم ہے۔ حفیظ نعمانی صاحب کے خاکوں کا انتخاب بھی بہت کارآمد ہے۔ اس میں بعض ایسے لوگوں کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں جن کی خدمات کا پوری طرح اعتراف نہیں کیا گیا۔ انھوں نے یہ مضامین لکھ کر اور آپ نے یہ مضامین شائع کر کے بڑا کام کیا۔ حفیظ صاحب کے سب مضامین پڑھنے اور محفوظ کر لینے کے لائق ہیں''۔ شمس الرحمٰن فاروقی جیسی نابغۂ روزگار شخصیت کے یہ جملے بڑے بھاری بھرکم ہیں۔ گویا انھوں نے اویس سنبھلی کے علمی و ادبی ذوق کو ایک سند تفویض کر دی۔

''فکر و احساس کی قندیلیں'' کا پیش لفظ پروفیسر شارب ردولوی نے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''نظیف الرحمٰن صاحب مذہبی مسائل کے ساتھ اردو نثر و نظم پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل ان کے ادبی مضامین ان کی تحقیقی و تنقیدی بصیرت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انھوں نے مثنوی ''زہر عشق'' پر بھی مضمون لکھا ہے جو ان کے جیسا مزاج رکھنے والے شخص کے لیے ایک مشکل کام تھا۔ انھوں نے تہذیبی لحاظ سے بعض باتوں پر اعتراض کیا ہے لیکن بڑی بات یہ ہے کہ نااتفاقی کے باوجود انھوں نے اس کی زبان و بیان، سلاست و سادگی، منظرنگاری اور حسن تاثیر کی پوری طرح داد دی ہے۔ میں انھیں نئے مجموعہ کی اشاعت پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ وہ اسی طرح علم و ادب کی خدمت انجام دیتے رہیں''۔

جبکہ ڈاکٹر عمیر منظر نے لکھا ہے:

''کتاب کے بیشتر مشتملات اس قابل ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے۔ کتاب سازی کے اس دور میں ایسی کتابیں کم ملتی ہیں جن میں فکر و احساس کی قندیلیں روشن ہوں۔ جن کے مطالعہ سے دل و دماغ دونوں کو طمانیت کا احساس ہو۔ قاری یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو کہ اردو زبان و ادب سے تعلق محض مجبوری کا نہیں ہوتا بلکہ ذوق وشوق کا ہوتا ہے اور یہی ذوق وشوق دوسروں کو مہمیز بھی کرتا ہے''۔

''بجھے دیوں کی قطار'' پر میں نے ایک تفصیلی تبصرہ کیا تھا جس کے آخر میں میں نے لکھا تھا:

''یہ کتاب مختلف شخصیات کی ایک قوس قزح ہے جس میں ہر قسم کے رنگ موجود ہیں۔ کتاب کا ہر مضمون لاجواب اور Exclusive ہے۔ یہ مضامین ایک ایسے شخص نے لکھے ہیں جس کے ان شخصیات سے گہرے اور دوستانہ رشتے رہے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے ان شخصیات کی زندگی کے منفی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا ہے لیکن اس میں نہ تو تنقیص کا پہلو ہے نہ استہزا کا۔ خوبیوں کا ذکر جس وقار سے کیا گیا ہے خامیوں پر گفتگو بھی اسی انداز سے کی گئی ہے۔ ان منفی باتوں سے نہ تو مثبت باتیں بے اثر ہوتی ہیں اور نہ ہی شخصیت پر کوئی حرف آتا ہے۔ ظاہر ہے یہ تحریر کا کمال ہے اور قلم کا جادو ہے جو ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتا۔ انھوں نے (اویس نے) لکھا ہے کہ حفیظ صاحب اس کتاب کی اشاعت کے لیے بالکل تیار نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ان مضامین میں کچھ ہے ہی نہیں کہ ان کو کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔ یہ ایک بڑے آدمی کی نشانی ہے۔ کتاب کے شروع میں شامل ان کا ''اعتراف گناہ'' بھی ان کے بڑے پن کی گواہی دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جو مذکورہ شخصیات کے مطالعے میں بے حد معاون ثابت ہوگی''۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا کہ اہلِ علم نے اویس سنبھلی کی تصنیفی و تالیفی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ لہٰذا میں کچھ اور اہل قلم کے خیالات پیش کرنا چاہتا ہوں۔ باغ سنبھلی کی شعری کائنات پر روزنامہ آگ لکھنؤ میں ایک تبصرہ شائع ہوا ہے جو معروف ادیب وصحافی ڈاکٹر اکبر علی بلگرامی کا تحریر کردہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس کتاب کی ورق گردانی سے اویس سنبھلی کی حس جمالیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ پیشکش کے ساتھ حسن سلیقہ بھی پیشکش میں چار چاند لگا سکتا ہے...... محمد فضل رب باغ سنبھلی اپنے استاد داغ دہلوی کی شعری روایت کے امین ہیں۔ ان کے آباو اجداد دہلی سے منتقل ہو کر سنبھل آباد ہوئے۔ باغ 1871 میں سنبھل میں پیدا ہوئے۔ ابتدا میں وارفتہ پھر ہمدم تخلص اختیار کیا۔ لیکن داغ دہلوی سے شرف تلمذ کے بعد استاد کے تخلص کے وزن پر باغ تخلص اختیار کیا۔ داغ کے شاگرد پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن جانشین داغ کا اعزاز میرے علم میں صرف تین شعرا کو حاصل ہوا۔ احسن مارہروی، نوح ناروی اور باغ سنبھلی کو۔ باغ سنبھلی عمر کے لحاظ سے سب سے سینئر تھے۔ ان کا انتقال دو اگست 1935 کو 64 برس کی عمر میں ہوا ...... اویس سنبھلی نے باغ کی شعری کائنات کو ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ سنبھل کی علمی ادبی و سیاسی تاریخ پر خود بھی بہ عنوان ابتدائیہ قلم اٹھایا اور مسعود الحسن عثمانی اور ڈاکٹر عمیر منظر سے بھی شاندار مضامین تحریر کروا کر شامل کتاب کیا۔ در حقیقت جہاں یہ کتاب تفہیم باغ سنبھلی کی اہم کڑی ہے اسی کے ساتھ سنبھل کو سمجھنے اور اس کی تفہیم کا بھی ایک کارگر ذریعہ ہے''۔

''حفیظ نعمانی: ایک عہد ایک تاریخ'' پر مرحوم مشرف عالم ذوقی لکھتے ہیں:

''کتاب کے پیش لفظ اور ایک دوسرے مضمون حفیظ نعمانی کی زندگی کے روشن نقوش میں اویس نے ایسے تمام نکات جمع کر لیے ہیں جو حفیظ نعمانی کی ذات کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ کتاب حفیظ نعمانی کو

ایک بھرپور خراج عقیدت کے ساتھ ساتھ آئندہ نسلوں کے لیے مشعل راہ بھی ہے۔ اس کاوش کے لیے برادرم اویس سنبھلی کو مبارکباد دیتا ہوں اور دعائیں بھی۔ ہم پرآشوب عہد کے گواہ ہیں اور اس عہد میں سچ لکھنا کوئی آسان کام نہیں''۔

''کاوشیں'' پر معروف صحافی معصوم مرادآبادی لکھتے ہیں:

''زیر نظر کتاب میں جہاں اویس نے مایۂ ناز شخصیات پر قلم اٹھایا ہے وہیں شعر وادب کے بعض ایسے کم معروف مگر مخلص قلمکاروں پر بھرپور طبع آزمائی کی ہے جنھیں زمانہ ان کا جائز مقام نہیں دے سکا۔ اچھے اور سچے قلمکار کی پہچان یہی ہوتی ہے کہ وہ نامی گرامی ہستیوں کے ساتھ اپنا نام جوڑ کر اپنا مصنوعی قد بلند کرنے کے بجائے شعر و ادب کے ایسے گوہر نایاب تلاش کرے جنھوں نے شہرت اور دنیا داری سے دور رہ کر صحیح معنوں میں علم و ادب کی خدمت کی ہے۔ اویس سنبھلی اس منزل سے سرخرو گزرے ہیں''۔

''نذر شارب'' پر محمد راشد خان ندوی لکھتے ہیں:

''حرف آغاز کے عنوان سے کتاب کے مرتب نے لکھا ہے کہ دہلی اُردو اکادمی نے اپنا سب سے بڑا کل ہند بہادر شاہ ظفر ایوارڈ (2018) پروفیسر شارب ردولوی کی خدمت میں پیش کیا۔ لہٰذا ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس خوشی کے موقع پر اہل لکھنؤ پر بھی کچھ ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ چنانچہ نذر شارب کی شکل میں انھیں خراج تحسین پیش کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ اخبارات اور سوشل میڈیا پر اس کا اعلان کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اتنے مضامین آگئے کہ انتخاب کی ضرورت پڑ گئی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو کم وقت میں ایک معیاری کتاب مرتب کر کے اویس سنبھلی نے نوجوان قلمکاروں کے لیے ایک مثال قائم کی ہے''۔

اویس سنبھلی کی یہ خوبی بھی ہے کہ وہ جہاں اہل علم کی قدر کرتے ہیں وہیں ان

سے اپنے تعلقات کو نبھانا بھی جانتے ہیں۔ کسی سے تعلق قائم کرنا تو آسان ہے مگر اس عہد ناپرساں میں اس تعلق کو نباہے جانا بہت مشکل ہے۔ اویس اس فن میں ماہر ہیں۔ انھوں نے چند سال قبل سعادت علی صدیقی کے بھائی شفاعت علی صدیقی پر بھی لکھنؤ میں ایک سیمینار کیا تھا۔ شفاعت علی صدیقی نے اپنی پوری زندگی آل انڈیا ریڈیو کے توسط سے علم و ادب کی بیش بہا خدمات میں گزار دی۔ اویس سنبھلی نے دو دہائیوں سے ریڈیو وائس آف امریکہ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے خاکسار کو اس سیمینار میں کلیدی خطبہ پیش کرنے کا حکم دیا۔ میں نے مضمون تو تیار کر لیا تھا مگر اپنی انتہائی اہم دفتری مصروفیات کی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکا۔ البتہ میں نے وہ مضمون ان کو ارسال کر دیا تھا جو سیمینار میں پڑھ کر سنایا گیا۔ انھوں نے 21 مارچ 2021 کو حفیظ نعمانی پر اپنی تازہ ترین کتاب کے سنبھل میں اجرا کا پروگرام بنایا۔ انھوں نے مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے صدر اور ماہر اسلامیات پرم شری پروفیسر اختر الواسع اور برادرم معصوم مرادآبادی کے ساتھ مجھے بھی اس میں شرکت کا حکم دیا۔ لیکن چونکہ اس وقت تک کرونا کی دوسری لہر شروع ہو گئی تھی اور بعض دوسری وجوہ سے بھی اس پروگرام کو ملتوی کر دینا پڑا۔

اویس سنبھلی بڑی خوبیوں کے مالک ہیں۔ مجھے جب بھی لکھنؤ میں کسی ادیب یا صحافی یا کسی اہم شخص کے رابطہ نمبر کی ضرورت ہوتی ہے تو میں انھی سے رابطہ قائم کرتا ہوں اور وہ مجھے مایوس نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ بھی لکھنؤ میں کوئی بھی کام ہو وہ ہمیشہ حاضر رہتے ہیں۔ ان کی یہ شخصی خوبیاں انھیں اپنے ہمعصروں میں ایک اہم مقام عطا کرتی ہیں۔ توقع ہے اور دعا بھی کہ وہ اسی طرح اپنا علمی و ادبی سفر جاری رکھیں گے تاکہ اہل علم کو ان کی صلاحیتوں سے استفادے کا موقع ملتا رہے اور ان کی گراں قدر تصنیفات ادبی ذخیرے میں قابل ذکر اضافہ بنتی رہیں۔

جون 2021

OO

شفیق الحسن

زمین پر قدم آسمان پر نگاہیں

''اسکائی ایڈورٹائزنگ اینڈ مارکیٹنگ'' کے مالک شفیق الحسن کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو انتہائی روشن اور تابناک ہے۔ یوں تو ان کی شناخت ایک کامیاب اشتہاری کمپنی کے مالک اور پبلشنگ میں مہارت رکھنے والے ایک فنکار کی ہے لیکن گزشتہ کچھ برسوں میں انھوں نے اپنی ایک اور شناخت قائم کی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ شناخت ان کے صحافتی جذبے کی مرہون منت ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ انھوں نے جب دیکھا کہ میڈیا میں فیک نیوز کا بول بالا بڑھتا جا رہا ہے تو انھوں نے قارئین کو مستند خبروں سے روبرو کرانے کا فیصلہ کیا۔ جب ہریانہ کے سولہ سالہ حافظ جنید کو ایک ٹرین کے سفر میں بیدردی کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا تو انھیں شدید دھچکہ لگا اور انھوں نے مستند خبروں کی آن لائن ترسیل کا تہیہ کر لیا۔ اس طرح انھوں نے پہلی بار 24 جون 2017 کو صبح کے ٹھیک آٹھ بجے واٹس ایپ نیوز کلپنگ کا آغاز کیا۔ رفتہ رفتہ ان کا شوق جنون بنتا گیا اور پھر اس مسلسل سروس کو 25 مارچ 2020 کو ایک ہزار دن مکمل ہو گئے۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اس درمیان انھوں نے یوروپ اور خلیجی ملکوں کے دورے کیے لیکن ایک دن بھی اس سروس کا ناغہ نہیں ہوا۔ وہ جہاں بھی رہے انھوں نے ہندوستانی وقت کے مطابق صبح کے ٹھیک آٹھ بجے سیکڑوں واٹس ایپ نمبروں پر خبریں جاری کر دیں۔ اس

درمیان وہ صحت کے مسائل سے بھی گزرے لیکن انھوں نے اس سروس میں تعطل نہیں آنے دیا۔ ان کی اس خدمت کا اعتراف ہندوستان سمیت دنیا کے مختلف ملکوں میں موجود ان سیکڑوں لوگوں نے کیا ہے جو اس سروس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ دبئی کی ایک تنظیم ''انجمن ادب'' نے انھیں ایک پروگرام میں مدعو کر کے ان کو استقبالیہ دیا اور ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے علاوہ ''انٹرنیشنل بک آف ریکارڈ'' نے سوشل میڈیا پر سب سے زیادہ دنوں تک نیوز کلپ سروس چلانے پر انھیں سند توصیف سے نوازا۔ یہ خدمت ان کی شخصیت کی ایک لازمی شناخت بن چکی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ صرف یہی کام ان کی شخصیت کی مکمل شناخت نہیں ہے۔ میرے نزدیک یہ کام ان کی شخصیت کا ایک اضافی پہلو ہے۔ ان کو سمجھنے کے لیے ان کے دیگر کاموں پر بھی نظر ڈالنی ہوگی۔ میں نے ستمبر 2012 میں ان پر ایک خاکہ نما مضمون لکھا تھا جسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون ان کی شخصیت اور کردار کے تشکیلی مراحل کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوگا:

اپنے ہم عمر ساتھیوں میں اگر کسی پر مجھے بہت زیادہ رشک آتا ہے تو اس شخص کا نام ہے شفیق الحسن، اسکائی ایڈورٹائزنگ اینڈ مارکیٹنگ کے سی ای او۔ رشک جس سکے کا ایک پہلو ہے، اس کے دوسرے پہلو کا نام حسد ہے۔ لیکن جب معاملہ شفیق الحسن کا ہو تو سکے کے دونوں جانب بس رشک ہی رشک رہ جاتا ہے حسد کافور ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان پر رشک کے ساتھ ساتھ پیار بھی آنے لگتا ہے۔ ان پر رشک کرنے کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ایک ان کی شاندار اور غیر معمولی کامیابی اور دوسری جو اس کی ضمنی وجہ ہے، یہ ہے کہ ہم دونوں نے تقریباً ایک ہی وقت میں قسمت آزمائی کے لیے دہلی میں قدم رکھا تھا۔ اتفاق دیکھیے کہ دونوں نے اپنے کریئر کا آغاز سابق رکن پارلیمنٹ و سفیر ہند جناب م۔ افضل کے اخبار ''ہفت روزہ اخبار نو'' سے کیا تھا۔ خاکسار شعبۂ ادارت میں تھا تو آنجناب شعبۂ سرکولیشن میں۔ م۔ افضل کو اپنے ادارے کے لیے اشتہارات کی ضرورت تھی لہٰذا انھوں نے شفیق الحسن کے سامنے ایک تجویز رکھی۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ اخبار کے لیے اشتہارات لائیں تو ہم آپ کو جو تنخواہ دے رہے ہیں وہ تو دیں گے ہی اوپر سے

پندرہ فیصد کمیشن بھی دیں گے۔ (آگے چل کر افضل صاحب کی یہ تجویز شفیق الحسن کے لیے ان کی بند تقدیر کی کنجی ثابت ہوئی)۔ بہر حال انھوں نے شروعات کی اور پھر ان کو ایک لائن مل گئی۔ لیکن اس وقت تک قسمت کی دیوی ان پر مہربان نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو ان کا انتظار ایک اور سابق رکن پارلیمنٹ جناب شاہد صدیقی کے ہفت روزہ اخبار "نئی دنیا" میں کر رہی تھی۔ دراصل ان کی کامیابی کا دروازہ نئی دنیا میں بند تھا۔ لہٰذا وہ نئی دنیا سے وابستہ ہو گئے اور انھوں نے بے پناہ محنت و مشقت کی جس کی وجہ سے وہ دروازہ کھل گیا۔ پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے بے سروسامانی کے عالم میں سرزمین دہلی کی طرف کوچ کرنے والا ایک بے یارومددگار اور منحنی سا نوجوان ایک معزز اور معتبر اشتہار کمپنی کا مالک بن گیا۔ ان دنوں نئی دنیا اردو صحافت کے پرعزم نوجوانوں کے لیے ایک بے حد پرکشش منزل تھی۔ متعدد لوگ نئی دنیا سے وابستہ ہوئے اور قسمت کی دیوی ان پر مسکرانے لگی۔ لیکن شفیق الحسن پر صرف قسمت کی دیوی ہی مہربان نہیں ہوئی بلکہ کامیابی کا دیوتا بھی مہربان ہو گیا اور اگر میں یہ کہوں تو شاید غلط نہیں ہوگا کہ قسمت کی دیوی اور کامیابی کا دیوتا دونوں ان پر عاشق ہو گئے اور نئی دنیا کے دروازوں نے ان کے سامنے ایک اور نئی دنیا کے دروازے چوپٹ کھول دیے جہاں اشتہاروں کی قلمرو اس شہزادے کا انتظار کر رہی تھی۔

لیکن یہ کہنا غلط ہوگا کہ شفیق الحسن کو الف لیلیٰ کے کسی داستانوی شہزادے کے مانند بیٹھے بٹھائے سب کچھ مل گیا۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے انھوں نے جس محنت شاقہ اور دقت نظر سے کام لیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شفیق الحسن محنت و مشقت، عزم و حوصلہ، قوت ارادی، تحمل و بردباری، عجز و انکساری، قدر افزائی و خاکساری، مردم شناسی، احسان شناسی، وقت شناسی، مستقبل شناسی اور ماضی نافراموشی کے مجموعے کا نام ہے۔ میں اکثر و بیشتر غور کرتا ہوں تو اس کے علاوہ کسی اور نتیجے پر نہیں پہنچتا کہ شفیق الحسن کی شخصیت میں سمندروں کی خوبیاں ہیں۔ جس طرح سمندر کی سطح بہت خاموش اور پرسکون دکھائی دیتی ہے اسی طرح شفیق الحسن بھی بظاہر خاموش نظر آتے ہیں۔ لیکن جس طرح سمندر کی گہرائیوں میں ہلچل مچی ہوتی ہے اسی طرح ان کے اندرون میں بھی ہمیشہ ایک ہلچل سی

مچی رہتی ہے۔ یہ ہلچل ان کو کسی کل چین نہیں لینے دیتی اور نئے نئے جہان معانی کی تلاش میں سرگرداں رکھتی ہے۔ عام طور پر لوگ ہنگامی حالات میں گھبرا جاتے ہیں اور غیر معمولی محنت سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کی شخصیت کا اصل جوہر ہنگامی حالات ہی میں کھلتا ہے۔ ایمر جنسی میں کیسے کام کیا جاتا ہے یہ کوئی ان سے اور ان کے رفقائے کار سے پوچھے۔ کچھ تجربات مجھے بھی ہیں۔ ان کی ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ کیسے بھی حالات ہوں گھبراتے نہیں اور ناموافق حالات میں بھی ان کی کوشش سب سے اچھا Out Put دینے کی ہوتی ہے۔ میرے خیال سے ان کے بہترین کارنامے ہنگامی حالات ہی کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ خواہ اشتہارات کے میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے ہوں یا پبلشنگ کے شعبے میں اپنی چھاپ چھوڑنی ہو، ہنگامی حالات میں ہنگامہ خیز انداز میں کام کر کے انھوں نے اپنے کارناموں میں شاندار اضافہ کیا ہے۔

شفیق الحسن نے جب اشتہاروں کی اپنی کمپنی قائم کرنی چاہی تو انھوں نے اس کے نام پر بہت غور کیا اور ''اسکائی ایڈورٹائزنگ اینڈ مارکیٹنگ'' کے نام سے کمپنی کھول لی۔ اگر آپ غور کریں تو پائیں گے کہ اس نام میں بڑی معنویت ہے، بڑی گہرائی ہے اور یہ نام ان کی شخصیت کا عکاس بھی ہے۔ اسکائی، یعنی آسمان۔ آسمانوں پر اسی کی نظر ہوتی ہے جس کے اندر قوت پرواز ہو۔ جس کے پاس بال و پر ہی نہیں اس کے نزدیک کیا آسمان کی بے کرانیاں اور کیا زمین کی وسعتیں، کسی کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن بازوؤں میں طاقت ہو اور پرواز کی تمنا ہو تو یہ کھلا ہوا آسمان مزید کھل جاتا ہے اور صاحبِ پرواز کے لیے اپنا دامن یوں وا کر دیتا ہے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کے لیے اپنی آغوش کھول دے۔

میں شفیق الحسن کی شخصیت میں اس نوزائیدہ پرندے کو بھی دیکھتا ہوں جس نے مولانا ابوالکلام آزاد کو بہت زیادہ متاثر کیا تھا۔ انھوں نے اپنی معرکہ آرا تصنیف ''غبار خاطر'' میں چڑیے اور چڑے کی کہانی بیان کی ہے۔ وہ اپنے ایک خط میں، جس میں انھوں نے گوریا پرندے کی دلچسپ حرکتوں کا ذکر کیا ہے، ایک جگہ چڑے کے اس نوزائیدہ بچے کا تذکرہ کرتے ہیں جس کو اس کی ماں دن بھر اڑنے کا سبق سکھاتی ہے لیکن وہ اڑ نہیں

پاتا۔اسی کشمکش میں دوروز گزر گئے۔مولانا اس کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں: ''تیسرے دن صبح کو ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔دھوپ کی ایک لکیر کمرہ کے اندر دور تک چلی گئی تھی۔یہ اس میں جا کر کھڑا ہو گیا۔پر گرے ہوئے، پاؤں مڑے ہوئے، آنکھیں حسب معمول بند تھیں۔اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ یکایک آنکھیں کھول کر ایک جھرجھری سی لے رہا ہے۔پھر گردن آگے کر کے فضا کی طرف دیکھنے لگا۔پھر گرے ہوئے پروں کو سکیڑ کر ایک دو مرتبہ کھولا بند کیا۔اور پھر جو ایک جست لگا کر اڑا تو ایک دفع تیر کی طرح میدان میں جا پہنچا اور پھر ہوائی کی طرح فضاؤں میں اڑ کر نظروں سے غائب ہو گیا...... دراصل یہ کچھ نہ تھا، زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشہ تھا...... جوں ہی اس کی خود شناسی جاگ اٹھی اور اسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ میں اڑنے والا پرندہ ہوں، اچانک قالب بے جان کی ہر چیز از سر نو جاندار بن گئی۔'' یہی حال شفیق الحسن کا ہے۔جب انھیں اس حقیقت کا ادراک ہو گیا کہ وہ چاہیں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں تو پھر انھوں نے ایک جھرجھری لی، اپنے عزائم کے بال و پر کھولے، ایک انگڑائی لی اور اسکائی کی بنیاد ڈال کر کامیابی کے بے کراں آسمانوں کی بے پناہ وسعتوں میں پرواز بھرنی شروع کر دی۔ کہتے ہیں کہ نام کے اثرات شخصیت پر ضرور پڑتے ہیں۔بہت حد تک اس میں سچائی ہے۔شفیق الحسن اپنے نام کے اعتبار سے انتہائی شفیق بھی ہیں۔ان کی شفقت و مہربانی کی برکھا ان کے دوستوں اور شناساؤں پر عموماً ہوتی رہتی ہے۔ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھوں نے نہ تو اپنے ماضی کو فراموش کیا ہے، نہ ہی ماضی کے ساتھیوں کو اور نہ ہی دور جد و جہد کے رفقا کو۔ مستقبل کی جانب گامزن رہنے کے دوران اگرچہ ان کی نگاہیں سامنے ہوتی ہیں لیکن شعور کی آنکھیں ماضی کے ایام پر جمی رہتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ کامیابی وکامرانی کی بلندیوں پر فائز ہونے کے باوجود ان کے اندر غرور و تکبر کا شائبہ تک نہیں آیا ہے۔یہ آج بھی اسی تبسم آمیز انکساری و خاکساری سے ملتے ہیں جس سے پہلے ملا کرتے تھے اور جوان کا طرۂ امتیاز بھی ہے۔

ان کی کس کس خوبی کا ذکر کیا جائے۔یہ تو سراپا خوباں ہیں۔جیسا کہ میں نے کہا

کہ ان کی نگاہیں آسمانوں کی وسعتوں میں رہتی ہیں۔ جی ہاں! لیکن اسی کے ساتھ ان کے قدم زمین پر جمے رہتے ہیں اور یہ اس شعر کے ترجمان بنے رہتے ہیں کہ "چاہے نظریں ہوں آسمانوں پر، پاؤں لیکن زمین پر رکھیے"۔ اور پھر یہ شعر بھی ان کے پیش نظر رہتا ہے کہ "بات کیا ہے یہ کون پرکھے گا، آپ لہجے کو معتبر رکھیے"۔ زمین پر پاؤں، آسمانوں پر نگاہیں اور لہجے کو معتبر رکھنے والی شخصیت کا نام ہے شفیق الحسن۔

(اسکائی ایڈورٹائزنگ اینڈ مارکیٹنگ کمپنی کی سلور جوبلی تقریب میں پڑھی گئی تحریر)

ستمبر 2012

OO

انجم نعیم

چھوٹی مشین کا بڑا پرزہ

انجم نعیم سے میرا تعلق بہت پرانا ہے۔ تقریباً اتنا ہی جتنا کہ دہلی سے۔ اس تعلق کی بنیاد اُس وقت غائبانہ طور پر پڑی جب وہ ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس کے ماہنامہ ''افکارِ ملی'' کے لیے اپنا طنزیہ و مزاحیہ کالم ''آخری صفحہ'' لکھا کرتے تھے۔ وہ کالم بہت مقبول تھا۔ اس وقت افکارِ ملی سے میرا کوئی عملی رشتہ تھا اور نہ ہی انجم نعیم سے۔ لیکن میں بھی دیگر قارئین کے مانند اس کالم کا مداح تھا۔ اس کے دو کالم مجھے آج تک یاد ہیں۔ جن دنوں شاہ بانو کا معاملہ سیاست وصحافت میں چھایا ہوا تھا اور عارف محمد خان اپنے مخصوص موقف کی وجہ سے بعض حلقوں میں معتوب تو بعض میں مرغوب بن گئے تھے، انھوں نے ایک کالم میں لکھا کہ انگریزی کا رسالہ Debonair خواتین کی عریاں تصاویر چھاپنے کے لیے بدنام ہے، اس کے رواں شمارے میں عارف محمد خان کی تصویر چھپی ہے۔ کچھ دنوں کے بعد جناب راشد شاز نے ''ملی پارلیمنٹ'' نامی ایک ادارہ قائم کیا اور ایک ہفت روزہ ''ملی ٹائمس'' کا اجرا کیا۔ میں اس کا ایڈیٹر انچارج تھا۔ ان دنوں بوسنیائی مسلمانوں کے خلاف جنگ چل رہی تھی۔ انھوں نے اعلان کیا کہ جو لوگ اس جنگ میں شامل ہونا چاہیں وہ انھیں مفت میں بوسنیا لے جائیں گے۔ انجم نعیم نے ایک کالم ان کی شخصیت پر وقف کر دیا جس میں انھوں نے یہ معرکۃ الآرا جملہ لکھا ''چھوٹا منہ اور چھوٹی چھوٹی باتیں۔''

بہر حال ان سے جو غائبانہ تعلق قائم ہوا تھا وہ جلد ہی حاضرانہ رشتے میں تبدیل ہو گیا۔ نام کی مناسبت سے وہ کالم رسالے کے آخری صفحے پر چھپتا تھا۔ لیکن جس طرح ممبئی کے اُردو ہفت روزہ ''بلٹز'' کے بہت سے قارئین ایک زمانے تک اس کا مطالعہ آخری صفحہ پر شائع ہونے والے معروف صحافی اور قلم کار خواجہ احمد عباس کے کالم ''آزاد قلم'' سے شروع کرتے تھے اسی طرح افکار ملی کے بھی لاتعداد قارئین اس کا مطالعہ آخری صفحے سے شروع کرتے تھے۔

یہ تو یاد نہیں کہ اُس وقت آپ کسی اخبار یا رسالے سے منسلک تھے یا نہیں لیکن بعد میں آل انڈیا ملی کونسل کے ہفت روزہ ''ملی اتحاد'' کے عملی ایڈیٹر بنا دیے گئے۔ عملی اس طرح کہ بہت سے اخباروں اور رسالوں کے مانند اس میں بھی ایڈیٹر شپ میں کسی اور کا نام شائع ہوتا تھا۔ انھوں نے بیرونی مدد حاصل کرنے کے لیے صحافیوں کی ایک ٹیم بنائی جس میں میں بھی شامل تھا۔ مجھ پر انجم نعیم ہمیشہ مہربانیاں لٹایا کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں۔ ان کا طریقۂ کار یہ تھا کہ قلمی معاونین کو کوئی خبر دیتے اور کہتے کہ اس پر فلاں فلاں لائن پر ایک مضمون لکھ ڈالیے۔ ایک روز انھوں نے مجھے تقریباً ڈیڑھ دو سو صفحات پر مشتمل ایک پلندہ تھمایا اور کہا کہ اس کو پڑھ ڈالیے اور ایک مضمون لکھ ڈالیے۔ میں نے گھبرا کے کہا کہ اتنا سارا مواد کون پڑھے گا اور کیا لکھے گا۔ انھوں نے برجستہ کہا کہ اس میں آپ کو کچھ کرنا ہی نہیں ہے، صرف محنت کرنی ہے۔ اس روز میں ان کی مہربانیوں کا قائل ہو گیا۔ پھر تو مہربانیوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ ملی اتحاد کے بند ہونے کے ساتھ ہی ختم ہوا۔ ان کی عنایاتِ بے پایاں کو دیکھ کر شیخ امام بخش ناسخ کے اس قطعہ پر ایمان لے آنا پڑا:

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا رونا تو پروانے کو جلنا
غم مجھ کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

بہر حال باہمی رشتوں کی اس گاڑی نے کب پٹری بدل لی مجھے ہوش نہیں۔ یہ گاڑی تکلفات کی پٹری سے اتر کر بے تکلفی کی پٹری پر چڑھ گئی اور فراٹے بھرنے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد قسمت نے یاوری کی (میری نہیں ان کی) اور آپ نئی دہلی میں واقع امریکن انفارمیشن سینٹر سے جاری ہونے والے رسالے ''اسپین'' کے پہلے مدیر بنا دیے گئے۔ اسپین کی ادارت کے دوران ایسی کوئی بھی تقریب نہیں گزری جس میں صحافیوں کو بھی مدعو کیا گیا ہو اور انھوں نے خاکسار کو فراموش کر دیا ہو۔ اس کے بعد حالات نے کچھ یوں پلٹا کھایا کہ انجم نعیم اس رسالے سے سبکدوش ہو گئے اور پھر آل انڈیا ریڈیو میں ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جہاں میں بھی حالات حاضرہ پر تبصرہ ''آج کی بات'' لکھا کرتا تھا اور وہ بھی۔ نائن الیون کے بعد امریکہ کی جانب سے دیگر ملکوں کے مانند ہندوستان سے بھی متشرع مسلمانوں کو بصد احترام مدعو کیا جاتا، ان کی خوب آؤ بھگت ہوتی، گھمایا پھرایا جاتا، انعام واکرام کی بارش ہوتی اور اس طرح وہ اپنا پر تعیش سفرِ امریکہ مکمل کر کے ایسے ہندوستان واپس آتے جیسے کہ عمرہ کر کے لوٹے ہوں۔ ایک روز میں نے ان سے کہا کہ فلاں مولوی صاحب کہہ رہے تھے کہ امریکہ نے مدعو کیا ہے، میں فلاں تاریخ کو جا رہا ہوں۔ انھوں نے برجستہ کہا کہ ہاں آجکل تو یہ عالم ہے کہ چلو بلاوا آیا ہے ماتا نے بلایا ہے۔ فقرہ بازی میں انجم نعیم کو ملکہ حاصل ہے۔ ابھی چند روز قبل میں نے ان سے کہا کہ مجھے وائس آف امریکہ کے لیے رپورٹنگ کے دوران ماہرین کے کمنٹس اور ان کاری ایکشن لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ بھی ایک سینئر صحافی ہیں کیا آپ کسی مسئلے پر کمنٹس نہیں دے سکتے۔ میں نے وضاحت کی کہ آپ گھبرائیں نہیں۔ آپ کو کوئی متنازعہ بیان نہیں دینا ہوگا، بس بے ضرر سا بیان دے دیجیے گا۔ کہنے لگے کہ ہاں ٹھیک ہے۔ میں بھی بے ضرر، میرا بیان بھی بے ضرر۔ ضرور لیا کیجیے۔

شروع میں میں نے ان کی مہربانیوں کا ذکر کیا ہے۔ میں یہ گوش گزار کرتا چلوں کہ وہ لاعلمی میں بھی مجھ پر مہربانیاں کرتے رہے ہیں۔ اردو صحافت میں انجم نعیم اور سہیل انجم کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ یہ میں خودستائی نہیں کر رہا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو

صحافیوں میں اور غالباً ہندی اور انگریزی میں بھی پورے ملک میں ہم دونوں کے علاوہ نہ تو دوسرا کوئی انجم نعیم ہے اور نہ ہی دوسرا کوئی سہیل انجم۔ صحافت میں میری شہرت یا بدنامی جو بھی آپ کہیں، شہرت کہوں گا تو اپنے منہ میاں مٹھو بننا ہوگا اور بدنامی کہوں گا تو اس کی زد انجم نعیم پر پڑے گی اس لیے آپ کو جو سمجھنا ہے وہ سمجھیں۔ میں تو صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس میں بھی ان کا ہاتھ ہے۔ ایک بار میرے ایک دوست نے اپنے ایک دوست سے میرا تعارف کرایا اور یہ کہتے ہوئے کہ یہ سہیل انجم ہیں یہ اُردو کے بہت بڑے صحافی ہیں، میری شان میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے۔ میری نظریں زمین میں گڑی رہیں۔ اُن کے دوست نے بڑی مسرت کا اظہار کیا اور بڑے پر جوش انداز میں کہا کہ ''اچھا اچھا آپ ہی اسپین کے ایڈیٹر ہیں؟''۔ ابھی تک میری نظریں زمین میں گڑی ہوئی تھیں اور اب میں خود گڑ گیا۔ ایک بار انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں غالباً دبئی کی ایک تنظیم نے مسلمانوں کے مسائل پر ایک بڑے پروگرام کا انعقاد کیا۔ میرے ایک اور دوست نے منتظمین میں سے ایک شخص سے ملوایا اور اسی طرح میری شان میں قصیدے پڑھے جیسا کہ ابھی میں نے ذکر کیا۔ وہ صاحب بہت خوش ہوئے، بے پناہ مسرت کا اظہار کیا اور کہا کہ ارے جناب میں تو آپ کے مضامین خوب پڑھتا ہوں۔ پھر انھوں نے ایک فائر کر دیا۔ پوچھنے لگے کہ کیا اب بھی آپ ''آخری صفحہ'' لکھتے ہیں۔ ایک بار حفیظ جالندھری اپنے ایک دوست کے ساتھ ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ ان کے دوست کے ایک شناسا بھی ٹرین میں مل گئے۔ وہ جالندھر کے تھے۔ انھوں نے اس سے حفیظ صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان سے ملیے، یہ حفیظ جالندھری ہیں۔ اس شخص نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا کہ اچھا اچھا آپ بھی جالندھر کے ہیں۔ اس واقعہ پر حفیظ جالندھری جس کیفیت سے گزرے تھے مجھے انجم نعیم کی وجہ سے بار بار گزرنا پڑتا ہے۔ اب اگر کوئی کسی سے میرا تعارف کراتا ہے تو میں پیچھا چھڑا کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیونکہ مجھے اس تعارف کے پیچھے انجم نعیم کا بھوت طنزیہ انداز میں مسکراتا ہوا نظر آنے لگتا ہے۔ اسی لیے میں نے کہا کہ میری شہرت یا بدنامی میں انجم نعیم کا بڑا ہاتھ ہے۔

ہمارے ایک ہندی صحافی دوست نے، جو بہت اچھے اور بڑے صحافی ہیں، اپنی پوری زندگی صحافت میں گزار دی لیکن وہ کبھی چھوٹے منصب پر نہیں رہے۔ ہمیشہ ایڈیٹر یا نیوز ایڈیٹر ہی رہے۔ ایک بار میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اتنے بڑے صحافی ہیں کسی بڑے قومی اخبار کو کیوں نہیں جوائن کرتے۔ انھوں نے کہا کہ سہیل انجم! کسی بڑی مشینری کا چھوٹا پرزہ بننے سے بہتر ہے کہ کسی چھوٹی مشینری کا بڑا پرزہ بن کے رہا جائے۔ میں جب بھی اُن کو سوچتا ہوں مجھے انجم نعیم یاد آجاتے ہیں۔ آجکل سہ ماہی مجلہ ''آج کے مباحث'' کی مشینری کا بڑا پرزہ انجم نعیم ہی ہیں۔ ان کے نام کے ساتھ جس منصب کا لاحقہ لگا ہوا ہے، یعنی مدیر اعلیٰ کا، اس کے لیے لوگ جانے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ انجم نعیم منصب کے پیچھے نہیں بھاگتے۔ منصب ان کے پیچھے پڑا رہتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ جہاں بھی رہے انھوں نے اس منصب کا حق ادا کیا۔ جی جان سے محنت تو کی ہی، اپنے نظریات کی چھاپ بھی چھوڑی۔

نومبر 2019

OO

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی

ایک پیاری شخصیت، ایک پیارا شاعر

علی بھائی (ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی) سے پہلی ملاقات کب ہوئی اور کیسے ہوئی یہ تو یاد نہیں لیکن میں نے پندرہ بیس سال کے تعلق کے عرصے میں ان کو ہمیشہ یکساں پایا۔ وہی شرافت، وہی شائستگی، وہی خندہ پیشانی، وہی خوش اخلاقی، وہی انکساری، وہی حسن سلوک اور وہی محبت اور وہی دوستانہ انداز۔ ان تمام اوصاف میں بیشی تو پائی لیکن کبھی کمی نہیں پائی۔ ان سے ملاقات ان کے دولت خانہ پر بھی ہوئی، آل انڈیا ریڈیو میں بھی ہوئی اور دوسرے مقامات پر بھی ہوئی۔ ہمیشہ تپاک سے ملنا اور کھل کر گفتگو کرنا ان کی فطرت اور طبیعت کا خاصہ ہے۔ وہ جس قدر قابل اور با صلاحیت ہیں اسی قدر منکسر المزاج بھی ہیں۔ لیکن ان کی ظاہری شخصیت بڑی ہی غیر متاثر کن ہے۔ اگر وہ پہلی بار کسی سے ملیں تو وہ ان سے کوئی اثر قبول نہیں کرے گا۔ لیکن ملاقات کا عرصہ جوں جوں بڑھتا جائے گا ان کے مزاج کی خصوصیات ابھرتی جائیں گی۔ اور پھر وہی شخص جس نے پہلی ملاقات میں ان کو نظر انداز کر دیا تھا ان کا احترام کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

علی بھائی جیسے باہر ہیں ویسے ہی اندر بھی ہیں۔ نہ کوئی چھل نہ کپٹ، نہ تعصب نہ تنگ نظری، نہ معاندانہ جذبات نہ احساس برتری۔ فارسی، اُردو اور انگریزی زبانوں پر عبور رکھنے والا یہ شخص اتنا سادہ لوح ہے کہ اس پر بلا کا پیار آتا ہے۔ علی بھائی کی سادہ لوحی

اوران کی شرافت سے بہت سے لوگوں نے ناجائز فائدے بھی اٹھائے ہیں۔ انھیں لوگوں سے دھوکے بھی ملے ہیں۔ بے وفائیاں بھی ملی ہیں۔ لیکن اگر ان سے ایسے لوگوں کے بارے میں پوچھا جائے تو شاید ہی وہ کسی ایسے شخص کا نام بتا سکیں۔ اس کی وجہ وہی ان کی شرافت نفسی ہے جو انھیں دوسروں سے ممتاز بناتی ہے۔ وہ کسی بھی بات کا برا بھی نہیں مانتے۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ ان کی سادہ لوحی پر ہم میں سے کسی نے سخت الفاظ میں کچھ کہہ دیا لیکن انھوں نے اس کا غلط مطلب نہیں نکالا۔ نہ ہی اسے دل میں رکھا۔ نہ تعلقات کی راہ میں آڑے آنے دیا۔

میں نے اکثر دیکھا ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے ایک افسر اعلیٰ ان کا مذاق اڑاتے اور انھیں ''استاذ الاساتذہ'' کہہ کر چھیڑنے کی کوشش کرتے۔ لیکن انھوں نے کبھی نہ تو ان کے انداز گفتگو پر اعتراض کیا اور نہ ہی ان کے دل میں کبھی یہ خیال آیا کہ انھیں ان سے قطع تعلق کر لینا چاہیے یا کم از کم ان سے ملنا جلنا چھوڑ دینا چاہیے یا کم کر دینا چاہیے۔ میں جب بھی آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں جاتا اور انھیں معلوم ہو جاتا تو یہ جانتے ہوئے بھی کہ افسر مذکور سے آمنا سامنا ہو سکتا ہے، وہ مجھ سے ملنے ضرور آتے۔ اتفاق سے عموماً ''ان'' سے مڈبھیڑ ہو جاتی اور وہ اپنے روایتی انداز میں چھیڑنے کی کوشش کرتے۔ لیکن علی بھائی ہمیشہ خندہ پیشانی کے ساتھ اور سر جھکا کر ان کی باتیں سنتے۔ وہ یہ نہیں کہتے کہ آپ میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کرتے ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ اس کے بعد عموماً ہم دونوں ایک ساتھ باہر نکلے لیکن انھوں نے ایک بار بھی دبے لفظوں میں ہی سہی ان کی شکایت نہیں کی۔ دوسری طرف افسر مذکور کا رویہ یہ ہوتا کہ جب ان کی غیر موجودگی میں ان کے بارے میں گفتگو ہوتی تو وہ ان کی بے حد تعریف کرتے اور کہتے کہ اگر علی بھائی زود گوئی ترک کر دیں اور سنجیدگی کے ساتھ شاعری کریں تو بہت اچھے شاعر ہو سکتے ہیں۔ انھوں نے ان کے پیٹھ پیچھے کبھی بھی ان کا مذاق نہیں اڑایا بلکہ عزت کے ساتھ ان کا ذکر کیا۔ میں کبھی کبھار سوچتا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟ تو دل و دماغ سے جواب آتا ہے کہ برقی اعظمی کی صلاحیت و قابلیت اور اس کے ساتھ ہی ان کی شرافت کے قائل

وہ بھی ہیں اور انھیں اس کا احساس بھی ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو اور فارسی سروس میں ایسا قابل ترین شخص کوئی دوسرا نہیں ہے۔ لیکن ان کی عادتوں اور ان کی سادہ لوح طبیعت کے پیش نظر وہ ان کو چھیڑنے پر مجبور ہو جاتے۔ صرف وہی کیوں، میں ایسے کئی لوگوں سے واقف ہوں جو ان کے سامنے تو انھیں باتوں میں اڑانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن غائبانہ میں ان کی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ اور یہ بات درست بھی ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کے اُردو اور فارسی شعبے میں ان سے قابل کوئی دوسرا شخص نہیں ہے۔ (اب تو علی بھائی اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو چکے ہیں)۔

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی سے تعلق اور ان کی شاعری کے پیش نظر اگر کوئی ان کی شخصیت کا مطالعہ کرنا چاہے تو پھر ان کی شخصیت کی پرتیں بیک وقت کھلنے کے بجائے رفتہ رفتہ کھلیں گی۔ یہ نہیں کہ ''اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے''۔ لیکن جوں جوں ان کی شخصیت کی پرتیں کھلتی جائیں گی، ایسا محسوس ہونے لگے گا کہ ہم ان کی شاعری کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ اسی طرح ان کی شاعری کے بالاستیعاب مطالعہ کے ساتھ ساتھ یہ احساس قوی ہوتا جائے گا کہ ہم برقی اعظمی کی شاعری کا نہیں بلکہ ان کی طبیعت اور ان کی شخصیت کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ گویا ان کی شاعری اور شخصیت دونوں ایک دوسرے کے لازم و ملزوم ہیں۔ اِن کو ان کی شاعری سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور ان کی شاعری کو ان کے مزاج سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ حالانکہ عام طور پر شعراء یا فنکار اپنی شاعری اور فنکاری سے الگ نظر آتے ہیں۔ یعنی ان میں تضاد ہوتا ہے۔ لیکن ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ نہ داخلی نہ خارجی۔ دونوں حالتیں ایک دوسرے میں مدغم ہیں۔ ان کو الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔

علی بھائی کی شاعری میں ان کی ذات تو پوری طرح موجود ہے ہی ان کی ذات کا کرب بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ کرب جو بیرونی اور اندرونی دنیا سے عبارت ہے۔ انھیں باہر سے جو کچھ ملا ہے اور اندر سے بھی جو کچھ ملا ہے وہ سب ان کے کلام میں نمایاں ہے۔ لیکن اشاروں کنایوں میں۔ نہ تو کہیں بھونڈا پن ہے اور نہ ہی حالات کا پر شور شکوہ۔ ساری

باتیں بہت ہی سلیقے کے ساتھ موجود ہیں۔ لیکن عام قاری کو وہ نظر نہیں آئیں گی۔ البتہ جو ان سے ذاتی طور پر واقف ہے وہ ضرور کچھ نہ کچھ سمجھ جائے گا۔ سچ بات یہ ہے کہ زمانہ نے ان کی قدر نہیں کی۔ زمانہ کو چھوڑیے، اپنوں سے بھی انھیں وہ محبت، اپنائیت اور عزت و وقار حاصل نہیں ہوا جس کے وہ مستحق ہیں۔ لیکن برقی اعظمی ''نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ'' میں یقین رکھتے ہیں۔ اسی لیے بہت سی بیرونی و اندرونی ناہمواریوں کے باوجود ان کی زندگی میں بظاہر کوئی کجی نظر نہیں آتی۔ اپنے بے تکلف دوستوں سے گفتگو میں وہ بہت سی باتیں ضرور بتاتے ہیں لیکن لطف لے لے کر۔ اپنی ناقدری کو بھی وہ لطف لے کر بتاتے ہیں۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انھوں نے کوئی ایسا واقعہ بیان کیا ہو جس سے ان کو تکلیف پہنچی ہو اور انھوں نے اس پر دکھ یا ملال کا اظہار کیا ہو۔ وہ ان واقعات سے بس ایسے گزر جاتے ہیں جیسے گلشن میں چہل قدمی کرتے وقت کچھ کانٹے آجائیں اور ان سے دامن کشاں گزر جایا جائے۔

میں علی بھائی کی شاعری پر کچھ زیادہ اظہار خیال نہیں کروں گا۔ کیونکہ ایک درجن سے زائد لوگوں نے ان کی شاعری پر مضامین قلمبند کیے ہیں اور اب ان کی شاعری کا کوئی ایسا گوشہ بچا نہیں ہے جس پر کچھ لکھا نہ گیا ہو۔ ہاں یہ بات ضرور کہنا چاہوں گا کہ اگر وہ اپنی زود گوئی پر ذرا سا انکش لگائیں اور اپنے بعض ہلکے اشعار کو قلم زد کرنے کی جرأت اپنے اندر پیدا کریں تو بہت اچھے شاعر بن سکتے ہیں۔ کبھی کبھی تو حیرت ہوتی ہے کہ اِدھر گفتگو ہوئی اور اُدھر پوری غزل یا نظم ردیف و قافیہ کے قالب میں ڈھل کر سامنے آ گئی۔ لیکن اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کی طبیعت ایسی موزوں ہے کہ وہ خواہی نہ خواہی غزلیں کہتے رہتے ہیں۔ برقی اعظمی کے مزاج اور ان کی طبیعت میں جو شعریت اور موزونیت ہے وہ ان کے والد اور استاد شاعر جناب رحمت علی برق اعظمی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ برق اعظمی اپنے دور کے ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ علی بھائی نے ان کی کلیات شائع کروائی اور دہلی میں اس کا اجرا عمل میں آیا۔ ان کو اپنے والد کے بے شمار اشعار یاد ہیں۔ وہ اپنے والد کی روایتوں کے امین بھی ہیں اور پاسدار بھی۔ وہ انھیں آگے بھی بڑھا

رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہیں ہوگا کہ وہ برق اعظمی کی شاعری اور ان کی روایت کے سچے نمائندہ ہیں۔ اور کیوں نہ ہوں کہ اگر پسر پدر کی روایتوں کو آگے نہ بڑھائے تو اسے اپنے باپ سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

انٹرنیٹ کے انقلاب نے ان کے اندر بھی انقلابی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ مجھے حیرت ہوتی ہے کہ کیسے انھوں نے اتنے کم عرصے میں کمپیوٹر سیکھ لیا اور انٹرنیٹ کے بحر ذخار میں غوطہ بھی لگا لیا۔ آج ہندوستان اور پاکستان اور پوری اردو دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جو انٹرنیٹ میں اس قدر غرق ہو۔ کسی کانفرنس یا مشاعرے میں ہیں۔ ابھی پروگرام چل ہی رہا ہے کہ انھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے اس کی رپورٹ بنائی اور کئی ویب سائٹوں کو پوسٹ کر دی۔ پروگرام ختم ہونے کے بعد لوگوں کو پتہ چلتا ہے کہ ان کی باتیں یا ان کی آواز پوری اردو دنیا میں پہنچ گئی ہے۔ وہ فیس بک کے بھی شہنشاہ ہیں۔ دن بھر میں جانے کتنی بار فیس بک پر اپنا پیج اپ ڈیٹ کرتے ہیں یا غزل اور شعر پوسٹ کرتے رہتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کوئی تصویر پوسٹ کریں گے تو اس کا کیپشن بھی منظوم ہی ہوگا۔ بالخصوص ان تصویروں کا جو ان کو عزیز ہوں۔ علی بھائی بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں۔ میں اپنی بات ان کے ہی ایک شعر پر ختم کرتا ہوں:

شعورِ معرفت مضمر ہے برقی خود شناسی میں
"خودی کا رازداں ہو جا خدا کا ترجماں ہو جا"

جنوری 2015

مولانا عبدالاحد مدنی

ایک خاموش خدمت گار

کچھ لوگ دکھاوے میں یقین رکھتے ہیں تو کچھ خاموشی سے کام کرنے میں۔ کچھ محض پروپیگنڈہ پر جیتے ہیں اور کچھ اپنے کاموں کی بدولت۔ کچھ لوگ کاغذی ادارے چلاتے ہیں تو کچھ لوگ حقیقی ادارہ چلانے کے باوجود شور نہیں مچاتے۔ کچھ لوگ فرضی کاغذوں اور دستاویزوں کی بنیاد پر دنیا بھر میں گھوم گھوم کر چندہ وصول کرتے ہیں تو کچھ لوگ اپنی جیب خاص سے خرچ کر کے فلاحی کام انجام دیتے ہیں۔ مولانا عبدالاحد مدنی دوسری قسم کے لوگوں میں شامل ہیں۔ نہ کسی کام کا پروپیگنڈہ نہ کوئی کروفر۔ نہ اپنی ذات کا پرچار اور نہ ہی اپنے کاموں کی تشہیر کر کے دولت جمع کرنے کی دُھن۔ دُھن ہے تو صرف کام کرنے کی۔ لالچ ہے تو صرف خدمت دین کا۔ خاموش خدمت میں یقین رکھتے ہیں۔ پروپیگنڈے سے دور رہتے ہیں اور ریاکاری سے نفرت کرتے ہیں۔ آج کے دور میں ایسے لوگ خال خال ہی ملیں گے۔ لیکن اسی قسم کے لوگوں کی وجہ سے اہل علم کا وقار اور اعتبار قائم ہے۔

وہ ایک استاد ہیں، ایک تعلیمی ادارے کے مالک ہیں اور ایک قابل اور باصلاحیت مصنف ہیں۔ عقیدے کی درستگی کی خاطر کتابیں تصنیف کرتے ہیں اور ضرورت مندوں کو فراہم کرتے ہیں۔ وہ تاریخی مدرسہ ریاض العلوم، اردو بازار، جامع مسجد میں

استاد حدیث ہیں۔ 1986 سے عالمیت اور فضیلت کے منتہی طلبہ کو بخاری شریف، ترمذی شریف اور اصول وتخریج کا درس دے رہے ہیں۔ مدرسے کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ بھی دیتے ہیں۔ باقی کے اوقات میں تصنیفی خدمات انجام دیتے ہیں اور اگر کہیں ضرورت ہے تو وعظ و نصیحت کے پروگراموں میں شریک ہو کر تبلیغ دین بھی کرتے ہیں۔ طلبہ سے بے حد محبت کرنے والے مولانا عبدالاحد مدنی کا طرز تدریس انتہائی موثر ہے جس کی وجہ سے وہ طلبہ میں مقبول بھی ہیں۔ ایک غیر متنازعہ استاد ہونے کے ساتھ ساتھ غیر متنازعہ عالم دین ہیں۔ استاد حدیث ہیں لیکن اس کا کوئی غرور اور گھمنڈ ان کے اندر نہیں ہے۔ ہر کسی سے انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا اور انکساری و خاکساری کے ساتھ پیش آنا ان کے مزاج میں داخل ہے۔ نہ کسی سے تلخ و ترش گفتگو کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کی شان میں کوئی گستاخی کرتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ حق بات کہنے کی جرأت بھی رکھتے ہیں۔

اس مصروفیت کے باوجود انھوں نے 1990 میں ایک دینی تعلیمی ادارے کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے وہ ادارہ ایسی جگہ کھولا ہے جہاں صحیح عقیدے کی تعلیم و تبلیغ کی ضرورت تھی۔ یعنی اتر پردیش کے ضلع سدھارتھ نگر میں واقع کونکٹی صدیق نگر چوراہا ڈومریا گنج میں۔ ان کے ادارے کا نام جامعہ رحمانیہ ہے اور قابلِ ذکر اور قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ وہ خود وہاں بہت کم جاتے ہیں۔ دہلی سے بیٹھ کر تمام معاملات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ ہاں ان کی نیابت ان کی اہلیہ کر رہی ہیں۔ وہ اس مدرسے کی ذمہ داری اور دیکھ ریکھ کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔ کیا یہ کسی مجاہدہ سے کم ہے کہ میاں بیوی محض دینی تعلیم کی خاطر ایک دوسرے سے الگ رہیں، ایک دوسرے سے دور رہیں۔ شوہر ایک تاریخی مدرسے میں حدیث کی تعلیم دیں اور بیوی ایک دینی تعلیمی ادارے کے نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھالیں۔ تاکہ آئندہ جو نسل پرورش پائے وہ اسلامی نسل ہو، عقیدے میں پختہ ہو اور شرک و بدعات اور خرافات سے دور ہو۔ اس قسم کی قربانی دینے کا مادہ اور جذبہ بہت کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ جامعہ رحمانیہ میں ابتدائی درجات سے لے کر فضیلت تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔ سر دست اس میں تین سو سے زائد طلبہ ہیں اور ایک درجن اساتذہ تدریسی

خدمات انجام دے رہے ہیں۔ پکّے چار بیگھے زمین پر واقع اس ادارے میں آٹھ بڑے بڑے ہال ہیں۔ ایک دو منزلہ شاندار مسجد ہے اور ایک ایسی بہترین لائبریری ہے جس میں قدیم و جدید علوم کی کتابیں جمع کر دی گئی ہیں۔ ضرورت مند حضرات اس لائبریری سے استفادہ کر سکتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ راقم الحروف کو کئی بار کچھ ایسی کتابوں کی ضرورت پڑی جو کسی اور لائبریری میں نہیں ملیں۔ جب ان سے ذکر کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ان کی لائبریری میں موجود ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ وہ لائبریری دہلی میں نہیں بلکہ سدھارتھ نگر ضلع میں واقع ان کے ادارے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ دہلی میں ان کی رہائش گاہ کتابوں سے خالی ہے۔ جامعہ نگر کے شاہین باغ علاقے میں واقع ان کے گھر پر بھی ایک بہت شاندار لائبریری ہے جس میں کام کی بہت زیادہ کتابیں موجود ہیں۔ کتابوں کے علاوہ رسائل و جرائد بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ علاقے کے لوگ وہاں جا کر ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ خود میں نے بارہا ان کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔

ان کی دینی خدمات کا ایک پہلو تصنیف و تالیف سے تعلق رکھتا ہے۔ آپ چونکہ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فارغ ہیں اس لیے ان کی تصانیف میں عقیدے کی درستگی پر بڑا زور ہوتا ہے۔ وہ مسائل کو قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کرتے ہیں اور انتہائی سادہ اسلوب بیان میں بات سمجھاتے ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان کی کتابیں ایسے موضوعات پر ہوتی ہیں جن پر شریعت کی روشنی میں لکھے جانے کی ضرورت ہے۔ وہ سماجی مسائل کو بھی اپنے قلم کے احاطے میں لاتے ہیں اور اسلامی انداز میں ان مسائل کا تجزیہ کر کے اسلام کی روشنی میں ان کا حل پیش کرتے ہیں۔ ان کی کتابوں کے ناموں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کتابوں میں کیا کچھ ہوگا۔ ان کی کچھ کتابوں کے نام یوں ہیں: عورتوں کے منفرد مسائل، زنا ایک عظیم سماجی جرم، نحوست و بدشگونی کتاب و سنت کی روشنی میں، حسن خاتمہ اسباب و علامات، حقوق خالق و مخلوق، نکاح اور اس کے آداب، قرض کے احکام اور عدم ادائیگی کا انجام، قربانی کے فضائل و مسائل اور تجلیات رمضان و احکام صیام۔ یہ کچھ نام ہیں ان کی کتابوں کے جن کے ذریعے وہ خاموشی کے ساتھ صحیح اسلام کی

تبلیغ کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی متعدد کتابیں ان کی تصنیف کردہ ہیں اور کئی موضوعات پر تخلیقی و تصنیفی کام جاری ہے۔

آج کے دور میں زنا ایک ایسا جرم بن گیا ہے جس پر پوری دنیا چیخ رہی ہے۔ خاص طور پر ہندوستان میں عصمت دری کے ایسے ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ لوگ لرز اُٹھتے ہیں۔ نہ تو حکومت ان واقعات پر قابو پانے میں کامیاب ہے اور نہ ہی پولیس محکمہ۔ آئے دن نابالغوں کے ساتھ بھی جنسی جرائم کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں۔ اس سے متعلق کتاب کے بعض عنوانات یوں ہیں: شرم گاہ کی حفاظت مومنوں کا اہم وصف، ہر طرح کی فحاشی حرام، زانیہ عورت سے شادی بغیر توبہ درست نہیں، چھ ماہ کا بچہ ناجائز نہیں، زانی مرد وعورت پر حد نافذ کرنے میں ترس نہ کھاؤ، بوقت زنا ایمان سلب ہو جاتا ہے، زنا کی ثقالت اور سنگینی، زنا انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے، کثرت زنا طاعون کی بیماری وقحط سالی کا سبب وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح عورتوں کے منفرد مسائل نامی کتاب میں ان مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے جو صرف عورتوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے حل کا اسلامی طریقہ بتایا گیا ہے۔ اس زمانے میں ایسے لوگوں کی بھرمار ہے جو کسی سے قرض لے کر اس کی ادائیگی کو بھول جاتے ہیں یا قرض کی ادائیگی کی انھیں کوئی فکر نہیں ہوتی یا ادا کرنا ہی نہیں چاہتے۔ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا سلوک ہوگا اور ان کا انجام کیا ہوگا اس کتاب میں بتایا گیا ہے۔ اس کے کچھ عنواتات یوں ہیں: ذاتی ضرورت کی تکمیل کے لیے قرض لینا، تجارتی کاروبار کے لیے قرض لینا، حکومت کا داخلی قرضے لینا، حکومت کا غیر ملکی قرضے لینا، کیا غیر سودی سرمایہ کاری ممکن ہے، قرض ادائیگی کی نیت سے لیا جائے، پہلی فرصت میں قرض ادا کرنے کا حکم، مقروض میت کی روح، مقروض شہدا کا بھی قرض معاف نہیں، مقروض میت کے قرض کی ادائیگی اس کے ورثا کریں، قرض اور حج، قرض اور جہاد، روزے کا قرض، قربانی کا قرض، نان نفقہ کا قرض وغیرہ وغیرہ۔ اس کتاب میں قرض سے متعلق اتنی باتیں ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں کہ اس موضوع پر شاید ہی کوئی گوشہ چھوٹا ہو۔ اسی طرح نحوست و بدشگونی کا بھی قرآن وحدیث کی روشنی میں مطالعہ کیا گیا ہے اور بتایا

گیا ہے کہ قرآن میں اس کی مذمت کی گئی ہے۔

آج ایسے لوگ ہمارے معاشرے میں بہت کم ہیں جو خلوص اور للّٰہیت کے ساتھ کام کرتے ہوں۔ معدودے چند ہیں لیکن یہ دنیا ایسے لوگوں کی قدر نہیں کرتی۔ بلکہ اس کے برعکس اس قسم کے لوگوں کی تحقیر کی جاتی ہے اور ان کا مذاق اڑایا جاتا ہے۔ ہاں ڈرامہ بازوں کی قدر ہے۔ دھوکے بازوں کی عزت ہے۔ فرضی مدرسے چلانے والوں کو چندے ملتے ہیں۔ جھوٹ بولنے والوں پر عطیات و خیرات کی بارش ہوتی ہے۔ لیکن اگر کوئی سچا آدمی کسی سے کچھ کہے تو اس کی باتوں پر یقین نہیں کیا جاتا۔ البتہ خوددار اور غیرت مند افراد اس قسم کی خرافات سے دور رہتے ہیں۔ مولانا عبدالاحد مدنی بھی انہی لوگوں میں ہیں جو ان برائیوں میں مبتلا نہیں ہیں۔ ایک مدرسے میں استاد حدیث ہیں تو نئی نسل کو سچا مسلمان بنانے کے لیے ادارہ چلاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ تعلیم یافتہ طبقے کے عقائد کی درستگی کے لیے کتابیں تصنیف کرتے ہیں۔ لیکن کسی کے سامنے نہ تو دست سوال دراز کرتے ہیں اور نہ ہی رسید چھپوا کر شہر شہر اور ملک ملک چندہ کرتے ہیں۔ ایسے مخلص خدمت گاروں کی اللہ کی جانب سے غیبی مدد ہوتی ہے۔ آنجناب بھی غیبی مدد کے سہارے یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے۔

اپریل 2015

OO

خراجِ عقیدت

مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری

یہ حقیقت ذہن قبول کرنے کو تیار نہیں ہے کہ مولانا عبداللہ مدنی جھنڈانگری اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ لیکن یہ ایک اٹل سچائی ہے اور قانون قدرت بھی ہے لہٰذا اسے تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ ابھی چند روز قبل ایک پروگرام میں شرکت کی غرض سے وہ دہلی آئے تھے۔ پروگرام ایک ہفتے کا تھا اور وہ پورے ہفتے رہے۔ اس موقع پر ان سے ملاقاتیں بھی رہیں۔ جس روز ان کو دہلی سے جانا تھا اس سے ایک روز قبل میں رات میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نہرو گیسٹ ہاؤس میں جہاں ان کا قیام تھا ملنے گیا۔ کافی دیر تک ساتھ رہا۔ ہم لوگوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا عبدالعظیم بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ چونکہ دل اور شوگر کے مریض تھے اس لیے جہاں بھی جاتے اپنے کسی نہ کسی بھائی کو ساتھ رکھتے۔ اس سے دس پندرہ روز قبل بھی وہ ایک اسی قسم کے پروگرام میں شرکت کی غرض سے دہلی آئے تھے۔ اس وقت ان کے دوسرے بھائی زاہد آزاد ان کے ساتھ تھے۔ اس وقت ان کا قیام ہوٹل ریور ویو ابوالفضل میں تھا۔ اس وقت بھی ہم لوگ کافی دیر ساتھ رہے۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ وہ دہلی آئیں اور خاکسار سے ملاقات نہ ہو یا میں اپنے وطن جاؤں اور ان کے دولت خانہ جھنڈانگر نیپال، جہاں ان کا ادارہ بھی ہے، نہ جاؤں اور ان سے ملاقات نہ کروں۔ یہ خیال کبھی بھی دل میں نہیں آیا کہ وہ اس طرح اچانک ہم لوگوں کو چھوڑ کر دنیا سے چل بسیں گے۔

21 دسمبر 2015 کو میں ان کے اور اپنے ایک بہت ہی خاص دوست شیخ

صلاح الدین مقبول احمد کے ساتھ منڈاولی، دہلی میں ایک پروگرام میں تھا۔ وہیں کٹھمنڈو سے فون آیا کہ مولانا مدنی کی طبیعت اچانک خراب ہو جانے کی وجہ سے ان کو ایک اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے، جہاں ان کے دل کا آپریشن ہوا ہے، مگر ان کی حالت نازک ہے، انھیں وینٹی لیٹر پر رکھا گیا ہے، ان کے لیے دعا کریں۔ میں نے فوراً ان کے بھائی، انجمن ارتقائے اردو ادب نیپال کے جنرل سکریٹری، عالمی یوم اردو کمیٹی کے نیپال کے کنوینز اور معروف شاعر زاہد آزاد جھنڈانگری کو فون کیا۔ انھوں نے بھی وہی باتیں بتائیں اور دعا کی درخواست کی۔ اگلے روز صبح پونے گیارہ بجے فون آیا کہ مولانا کا انتقال ہو چکا ہے۔ یقین نہیں آیا۔ ان کے گھر فون کیا۔ خبر کی تصدیق ہو گئی۔ حالانکہ ان کی حالت اتنی خراب نہیں تھی کہ ایسا حادثہ پیش آتا۔ انھیں کٹھمنڈو کے سب سے اچھے ہارٹ ہاسپٹل میں داخل کیا گیا تھا۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ چونکہ کئی نسیں بلاک ہو گئی ہیں اس لیے ایک چھوٹا سا آپریشن کرنا پڑے گا۔ آپریشن ہوا مگر اسی درمیان ان کا شوگر لیول پانچ سو سے اوپر پہنچ گیا۔ دواؤں نے کام کرنا بند کر دیا۔ اس طرح عالم بے ہوشی میں روح پرواز کر گئی۔ اسپتال کے ڈاکٹر بھی حیران تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ مولانا تو اپنے پیروں پر چل کر خوش وخرم آئے تھے۔ ذرا سی تکلیف تھی۔ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا۔ لیکن شاید قدرت کو اسی بہانے انھیں دنیا سے اٹھانا تھا۔

مولانا عبد اللہ مدنی کثیر جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ جامعہ سلفیہ بنارس، ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ انھوں نے نیپال کے جھنڈانگر میں جسے کرشنا نگر بھی کہا جاتا ہے، 80 کی دہائی میں مرکز التوحید کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا جس کے تحت لڑکیوں کا تعلیمی ادارہ "مدرسہ خدیجۃ الکبریٰ للبنات" چل رہا ہے۔ اس ادارے سے سیکڑوں لڑکیاں دینی تعلیم حاصل کر کے عالمہ وفاضلہ بن کر باہر آئیں۔ ان میں سے کئی مختلف اداروں میں تدریسی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ مرکز التوحید کے تحت ایک شاندار لائبریری بھی ہے جس کی اپنی عمارت ہے اور جس سے بہت سے تشنگان علوم استفادہ کرتے ہیں۔ انھوں نے تقریباً تیس سال قبل "نور توحید"

کے نام سے ایک دینی ماہنامے کا اجرا کیا تھا جو اب بھی پابندی کے ساتھ مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ مولانا اس کے مدیر مسؤل تھے۔ اس کا اداریہ وہی تحریر کرتے۔ انتہائی مختصر مگر جامع اداریے میں جس کا عنوان ''شعور و آگہی'' ہوتا تھا، مختلف مسائل پر قرآن و سنت کی روشنی میں اظہار خیال کرتے۔ وہ نیپال کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا اردو مذہبی رسالہ ہے۔ خاکسار اس کے ادارتی بورڈ میں شامل ہے۔ انھوں نے اس رسالہ کے ذریعے ملک نیپال میں اُردو زبان میں اسلام کی جو شمع جلائی تھی اس سے بہت سے گم گشتہ افراد کو صحیح راستے کا پتہ چلا۔

میں نے ان کے اداریوں پر ایک بھرپور تبصراتی مضمون قلمبند کیا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ اس مضمون کے کچھ اقتباسات پیش کروں تاکہ قارئین کو ان کی قلمی صلاحیت کا بھی اندازہ ہو سکے:

''مولانا مدنی رسالے کے پہلے اداریہ میں لکھتے ہیں'' ہمالہ کی بلند و بالا چوٹی فکر و نظر کو نئی وسعتوں سے روشناس کرتی ہے مگر خود مسلمانان نیپال ان وسعتوں کو اپنے دامن میں جگہ نہ دے سکے۔ ان کی دینی اور تعلیمی صورت حال نہ صرف قابل افسوس ہے بلکہ ملت کا ایک عظیم المیہ بھی ہے...... نیپال دنیا کا وہ اکیلا ملک ہے جہاں مسلمانوں کا اپنا کوئی اخبار، جریدہ یا مجلہ نہیں ہے۔ بعض قابل قدر کوششیں اس میدان میں ہوئی ہیں مگر افراد ملت کی بے توجہی، مخلصانہ تعاون کی کمی اور ذہن و فکر کی آوارگی نے اپنا رنگ دکھایا اور وہ پرچے اپنی عمر کا ایک سال بھی پورا کرنے سے قبل منظر سے دور ہو گئے''۔

اس خلا کو پر کرنے کے لیے اور ذہن و فکر کی آوارگی کو تعمیری انداز میں موڑنے کے لیے مولانا عبداللہ مدنی نے اس رسالے کا آغاز کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اس راہ میں پیش آنے والی دشواریوں اور مشکلات کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اپنے عزم و ارادے کا اس انداز میں ذکر بھی کر دیا ہے کہ کچھ سمجھ کر ہی ہوا ہوں موج دریا کا حریف۔ ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے۔

یہ پہلا اداریہ مئی 1988 کے شمارے کا ہے اور اس کے بعد سے لے کر آج

تک وہ موج دریا کے حریف بنے ہوئے ہیں اور مقابل ہواؤں کا سامنا کرتے ہوئے کشتیٔ صحافت کو موجوں کے حوالے کیے ہوئے ہیں۔ یاس و بے حسی کی گھٹاٹوپ تاریکی میں بھی انھوں نے امید کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ بقول ان کے ہم خلوص دل کے ساتھ اگر یہ خدمت انجام دیتے رہے تو نیپالی مسلمانوں کے دلوں میں راہ حق کی جستجو کا جذبہ یقیناً پیدا ہو جائے گا۔ تمام تر مخالف حالات کو سامنے رکھتے ہوئے مگر ایک لازمی اور خوشگوار دینی فریضے کو اپنا مقصد عظیم بناتے ہوئے انھوں نے جو سفر شروع کیا تھا وہ آج بھی جاری ہے۔

ایک سچے صحافی اور کامیاب مدیر کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ حال پر نظر رکھے، ماضی سے سبق حاصل کرے اور ایک روشن مستقبل کے لیے فضا سازگار کرتا رہے۔ مولانا عبداللہ مدنی اس تقاضے سے خوب واقف ہیں۔ جبھی تو ضرورت وقت کے تحت اداریے اور شذرات قلمبند کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں یکسانیت کے باوجود موضوعات میں تنوع ہے اور انھوں نے جس موضوع پر بھی اظہار خیال کیا ہے اس کی گہرائیوں میں اتر کر معانی ومفاہیم کے موتی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ کوئی دینی موضوع ہو یا دنیاوی، اس بات کا شاہد ہے کہ اس کا لکھنے والا اور معاملات کی باریکیوں کا تجزیہ کرنے والا اس موضوع کا گہرا علم رکھتا ہے اور ڈوب کر لکھنے کی صلاحیت کا مالک ہے۔

مختلف معاملات و مسائل کے تعلق سے ان کا قلم صرف ملک نیپال تک محدود نہیں ہے، وہ سرحدوں کا پابند نہیں ہے اور اسے کوئی بھی مشکل پابہ زنجیر نہیں کر سکی ہے۔ ایسا ہونا بھی نہیں چاہیے تھا۔ ایک صحافی کا قلم انسانیت کی امانت ہوتا ہے۔ یہ اس کا فریضہ ہے کہ وہ انسانیت کو درپیش چیلنجوں اور مسائل ومصائب کا نہ صرف یہ کہ حق وانصاف کے ساتھ اور غیر جانبدارانہ انداز میں تجزیہ کرے بلکہ بنی نوع انسان کو ان سے نجات دلانے کی تدابیر بھی بجھائے۔ مدیر نور توحید اس کسوٹی پر کھرے اترتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے جہاں پاکستان کے حالات پر خامہ فرسائی کی ہے اور وہاں کے سابق صدر جنرل ضیاء الحق کی دلدوز موت پر انھیں دل کی گہرائیوں سے خراج عقیدت پیش کیا ہے وہیں ہندوستانی مسلمانوں کے ساتھ بعض معاملات میں ہو رہی ناانصافیوں کے خلاف

صدائے احتجاج بھی بلند کی ہے۔ انھوں نے سلمان رشدی کو ''حق کا دشمن، نفس کا پابند، باطل کا غلام'' قرار دیا ہے اور بے نظیر بھٹو کے پاکستان کی وزیر اعظم منتخب ہونے پر شریعت اسلامیہ کی روشنی میں اس کا محاکمہ بھی کیا ہے۔ انھوں نے بوسنیا کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والے مظالم پر شدید نکتہ چینی کی ہے تو فلسطینی مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے مظالم پر اسلام دشمنوں کی خبر بھی لی ہے۔ 1989 میں مسجد حرام میں بم دھماکہ کرنے والے شر پسندوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کی اپیل بھی کی ہے اور پھر یہی نہیں بلکہ دنیا کے دیگر ملکوں میں ملت اسلامیہ کی حالت زار کا با چشم نم نقشہ کھینچتے ہوئے اللہ سے دعا بھی کی ہے کہ وہ اس ملت مظلوم پر رحم فرمائے اور اس کی دشواریوں کو کم کرے اور اسے آزمائشوں سے نجات دے۔ انھوں نے اسلام کے نام پر مسلمانوں میں پھیلی ہوئی گمراہیوں اور بدعقیدگی کی تاریکیوں کو دور کرنے کے لیے حقیقی شریعت کو پیش کیا ہے اور بھٹکے ہوئے مسلمانوں کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ وہ جسے اسلام سمجھ رہے ہیں وہ اسلام نہیں مخالفتِ اسلام ہے۔

اس کے ساتھ ہی مولانا عبداللہ مدنی نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور برعکس حالات کے لیے انھیں بری الذمہ قرار نہیں دیا ہے۔ بلکہ ایک مضمون میں ''کیا نہ بیچوگے جو مل جائیں صنم پتھر کے'' کے عنوان سے لکھا ہے ''ہمارے دلوں میں جلنے والی قندیل ایمانی بجھ رہی ہے، لوگ اسلامی تعلیمات سے روگرداں اور اسلام کی امتیازی صفات و خصائل سے گریزاں نظر آتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ عقیدۂ توحید پر ضرب کاری لگانے والے اعمال و عادات مسلمانوں نے اپنے درمیان رائج کر لی ہیں اور اللہ کے نیک بندوں کی قبروں کو زیارت گاہ بنا ڈالا ہے...... بابری مسجد کو گرا کر ایک عالیشان مندر کی تعمیر کا ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کیا جا چکا ہے اور ہم ہیں کہ درگاہ کی تصویر اور اپنی تلوار وزیر اعظم کو پیش کر کے اور چوبیس گز کی مخملی چادر چڑھوا کر اپنی عظمت و رفعت کو سر بازار نیلام کر رہے ہیں''۔ اسی طرح ایک دوسرے اداریہ میں مسلمانوں سے سوال کیا گیا ہے کہ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔

جب خلیجی جنگ چل رہی تھی تو اردو صحافت کے علمبردار اپنے اپنے مفادات کے تحت کام کر رہے تھے اور ان کے مضامین اور رپورٹوں سے یہ اندازہ لگانا دشوار تھا کہ حق پر کون ہے اور ناحق پر کون ہے۔ ظالم کون ہے اور مظلوم کون؟ اس صورت حال کا نور توحید میں بھی جائزہ لیا گیا اور ایک اداریہ میں مولانا نے یوں شکوہ کیا ''ہمیں شکایت ہے ان تمام قلم کاروں سے جو جنگ کے انجام سے واقفیت کے باوجود قارئین کا مزاج بگاڑتے رہے۔ کاش وہ واقعات وحوادث کا بے لاگ تجزیہ کر کے اپنے قاری کو صحیح صورت حال سے آگاہ کرتے اور کسی وقتی منفعت کی امید میں قلم کی سیاہی کو ضائع ہونے سے بچالیتے''۔ انھوں نے بنگلہ دیش کے قدرتی طوفان پر بھی اظہار خیال کیا اور ہندوستان میں فرقہ پرستی کے طوفان کا بھی حقیقت بیں نگاہوں سے جائزہ لیا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ کہیں بھی ان کا قلم راہ حق سے بھٹکا نہیں ہے۔ ایک سچے عالم دین اور انصاف پسند صحافی سے اسی کی توقع تھی۔

ان کے اداریوں کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ مولانا عبداللہ مدنی کی تحریروں کی کئی خصوصیات ہیں۔ ان کا قلم رواں دواں ہے۔ ان کی تحریروں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مختصر مگر جامع ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مضامین اور ان مضامین میں چھوٹے چھوٹے جملے ان کی تحریروں کو ایک خاص امتیاز عطا کرتے ہیں۔ ان کی تحریریں غیر ضروری تفصیلات سے پاک ہیں اور انگریزی میں کہیں تو To The Point باتیں کی گئی ہیں۔ مضامین مختصر ہونے کے باوجود دلائل سے پر ہیں اور کوئی بھی بات بغیر ثبوت کے نہیں کہی گئی ہے۔ آج کی مصروف ترین زندگی میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ داستانوں کو پڑھے۔ ہر مصروف شخص چھوٹے مضمون کی تلاش میں رہتا ہے۔ لیکن چھوٹا مضمون لکھنا آسان نہیں ہے۔ بہت مشکل ہے۔ کم سے کم جملوں میں اپنی بات وہی کہہ سکتا ہے جس کو بات کرنے کا سلیقہ اور جسے مافی الضمیر ادا کرنے کا ہنر آتا ہو۔ یہ کام کوزے میں دریا کو بند کرنے کے مترادف ہے۔ مولانا کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کبھی جھنجلاہٹ کے شکار نہیں ہوتے۔ کسی کی مخالفت بھی کرتے ہیں تو قرینے سے کرتے ہیں اور تلخ سے تلخ

بات بھی بے حد نرمی کے ساتھ کہہ جاتے ہیں۔ ان کا قلم کہیں بھی ذاتی عناد کی آلائشوں میں ملوث نہیں ہوتا۔ کہیں بھی ایسا نہیں لگتا کہ ان کے قلم میں روشنائی کی جگہ بغض و کینہ کا سیال رواں ہے۔

مولانا کے اداریوں کی ایک خوبی دلچسپ عنوانات قائم کرنا بھی ہے۔ کہیں کہیں وہ کسی مصرعے کو عنوان کے طور پر باندھتے ہیں اور وہ ایسا جامع ہوتا ہے کہ اس کو پڑھتے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مضمون میں کیا کچھ کہا گیا ہوگا۔ مثال کے طور پر: دنیا کے بتکدے میں پہلا وہ گھر خدا کا، شاید کہ اتر جائے ترے دل میں مری بات، جن کی تدبیر جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال، دعائے خلیل اور نوید مسیحا، فولاد اور مان لے لوہا حریر کا، کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے، حذر اے چیراں دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں، تلخی سہی کلام میں......، طاؤس و رباب آخر......، حیا نہیں ہے زمانے کی آنکھ میں باقی، کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں، اے گرفتار ابوبکر و علی ہشیار باش، جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے، بچشم نم اسے رخصت کیا ہے، بدلتی ہے جس وقت ظالم کی نیت، اپنی کمینگی پہ ہیں نازاں ذلیل لوگ۔ وغیرہ۔ مولانا عبداللہ مدنی کا قلم موضوع کی مناسبت سے اپنا انداز بدلتا ہے۔ ان کی تحریر میں موضوعات کی مناسبت سے سرخوشی و سرمستی بھی ہے اور سوز و گداز بھی ہے۔ لب و لہجے میں شیرینی بھی ہے اور تیکھاپن بھی ہے۔ انہوں نے اپنے قلم کو ایک نشتر کی مانند بھی استعمال کیا ہے اور فرحت و انبساط کا پیکر بھی بنایا ہے۔ انھوں نے تازہ خواہی داشتن کے مصداق بوقت ضرورت پرانے زخموں کا جائزہ بھی لیا ہے اور نئے زخموں پر پنبہ گری بھی کی ہے۔ ان کے قلم نے ملت اسلامیہ کے زخموں کے لیے مسیحائی کا بھی کام کیا ہے اور رہنمایان قوم کو آئینہ بھی دکھایا ہے۔ ان کی تحریر میں سوز بھی ہے اور ساز بھی ہے۔ جذبہ بھی ہے اور جذبات بھی ہیں۔ ناز بھی ہے اور نیاز بھی ہے۔ نغمہ بھی ہے اور نغمگی بھی ہے۔ عقیدہ بھی ہے اور عقیدت بھی ہے۔ حقیقت بینی بھی ہے اور حق بیانی بھی ہے۔ خودی بھی ہے اور خودداری بھی ہے۔ درد بھی ہے اور دردمندی بھی ہے اور دل سوزی بھی ہے اور دل نوازی بھی ہے۔ غرض جیسا موضوع ہے ویسا اسلوب تحریر ہے''۔

مولانا عبداللہ مدنی نہ صرف نیپال میں بلکہ پورے عالم اسلام میں جانے پہچانے جاتے تھے۔ وہ نیپال کے چند معزز علماء میں سرفہرست تھے۔ وہ جمعیت اہلحدیث نیپال کے سرپرست تھے۔ انھوں نے کبھی اسے پسند نہیں کیا کہ وہ خود الیکشن لڑیں۔ اس لیے انھیں سرپرست بنایا جاتا رہا۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں ہونے والی اسلامی کانفرنسوں، سمیناروں اور پروگراموں میں وہی نیپال سے جماعت اہلحدیث کی نمائندگی کرتے تھے۔ نیپال کے متعدد سیاست دانوں سے بھی ان کے بہت گہرے مراسم رہے۔ ان کے یہاں منعقد ہونے والے اکثر پروگراموں میں وہاں کے سیاست داں بھی شریک ہوتے۔ انھوں نے نیپال کے قصر صدارت میں ایک اسلامی کانفرنس منعقد کروائی تھی اور پہلی بار وہاں قرآن مجید کی تلاوت ہوئی تھی۔ نیپال کی علمی شخصیات سے ان کا گہرا تعلق رہا۔ متعدد سینئر وکلا اور جج حضرات سے بھی ان کا دوستانہ تھا۔ خاص طور پر سپریم کورٹ آف نیپال کے جج طاہر علی انصاری سے ان کے بے حد قریبی مراسم رہے۔ وہ ان کے ادارے میں ہونے والے پروگراموں میں اکثر و بیشتر شرکت کرتے۔ ایک بار ایک ہند نیپال سمینار میں دہلی سے خاکسار نے بھی جج صاحب کے ساتھ شرکت کی سعادت حاصل کی تھی۔ اس کے علاوہ بھی ان کے سالانہ پروگراموں اور وقتاً فوقتاً ہونے والے سمیناروں میں راقم شریک ہوتا رہا ہے۔ صحافت کے سلسلے میں انھوں نے کئی سمینار کیے تھے۔ ایسے پروگراموں کے بارے میں وہ مجھ سے ضرور مشورہ کرتے۔ دہلی، لکھنؤ، ممبئی، بنارس اور دوسرے شہروں کے اسکالروں کو بلاتے اور ان کے خیالات سے اہل نیپال کو واقف کراتے۔ ابھی پچھلے سال مولانا عبدالسلام رحمانی کے انتقال کے بعد انھوں نے جو سمینار کیا تھا اس میں میں نے بھی بحیثیت مقالہ نگار شرکت کی تھی۔ وہ ایک عالم دین اور صحافی ہی نہیں تھے بلکہ ایک بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ حامد سراجی ان کا تخلص تھا۔ ان کا کلام بعض اوقات ملی رسائل میں شائع ہوتا۔ ویسے وہ رسائل و جرائد میں کلام کی اشاعت میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ ہاں ان کے اپنے رسالہ نور توحید میں ان کا کلام برابر شائع ہوتا رہا ہے۔ ان کے ادارے میں ان کے بھائی زاہد آزاد کے زیر اہتمام اکثر و بیشتر مشاعروں اور شعری نشستوں کا بھی

اہتمام کیا جاتا ہے جن میں بالخصوص اس علاقے کے شعراء شرکت کرتے ہیں۔

ان کے خاندان سے ہمارے خاندانی روابط رہے ہیں۔ انھوں نے میرے بڑے بھائی حماد انجم ایڈووکیٹ کا ایک شعری مجموعہ ''خوشۂ کشت حرم'' اور میری کتاب ''میڈیا روپ بہروپ'' کا ہندی ترجمہ اپنے ادارے سے شائع کیا تھا۔ میری گزارش پر انھوں نے نومبر میں جاری کیے جانے والے مولانا ثناء اللہ امرتسری یادگار مجلّہ کے لیے ایک مضمون تحریر کیا تھا۔ انھوں نے میری خاکوں کی کتاب ''نقش بر آب'' پر جلد ہی کچھ تحریر کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ ایسی بہت سی باتیں ہیں جو یاد آ آ کر تڑپا رہی ہیں۔ لیکن اب ان کی یادوں کے علاوہ ہم لوگوں کے پاس کیا ہے۔ اللہ ان کی لغزشوں کو درگزر کرے اور ان کے درجات بلند کرے۔ آمین۔

دسمبر 2015

OO

مولانا عبدالوہاب خلجی

میں نے 13/اپریل 2018 کو دوپہر کے وقت مولانا عبدالوہاب خلجی صاحب کے بیٹے جناب محمد صاحب کو فون کیا۔ ان سے مولانا کے بارے میں دریافت کیا اور یہ جاننا چاہا کہ کیا وہ اب بھی اسپتال میں ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ نہیں وہ اب گھر آ گئے ہیں۔ میں نے پوچھا کیسے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ اچھے نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا میں کل دن میں گیارہ بجے آکر مولانا سے مل سکتا ہوں یا ان کو دیکھ سکتا ہوں؟ انھوں نے کہا کہ ہاں ہاں کیوں نہیں۔ آپ ضرور آیئے۔ میں اسی روز جانا چاہتا تھا لیکن اس روز دہلی اُردو اکادمی کے دفتر میں ایک اہم میٹنگ تھی جس میں میری حاضری ضروری تھی، لہٰذا میں وہاں چلا گیا۔ شام کو گھر آیا تو معلوم ہوا کہ خلجی صاحب کا تین بجے کے بعد انتقال ہوگیا ہے۔ دل و دماغ کو شدید دھچکہ لگا۔ میں خود کو ملامت کرتا رہا کہ آج ہی کیوں نہیں چلا گیا۔ پھر رات تک مختلف احباب سے فون پر تبادلۂ خیال ہوتا رہا جن میں نوائے اسلام کے مدیر محبی و مکرمی مولانا عزیز عمر سلفی صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے خلجی صاحب کے انتقال پر انتہائی دکھ درد اور رنج و غم کا اظہار کیا۔ اس حوالے سے جمعیت و جماعت کے تعلق سے کافی دیر تک رنجیدہ قسم کی گفتگو ہوتی رہی۔ انھوں نے خلجی صاحب کے انتقال کو جماعت کا ایک زبردست خسارہ قرار دیا۔

یہ معلوم ہو جانے پر کہ اگلی صبح دس بجے ان کی تدفین ہے اور نماز جنازہ وہیں دریا گنج کے پٹودی ہاؤس ہی میں واقع اونچی مسجد کے زیرِ سایہ ادا کی جائے گی، اگلی صبح میں

سوا آٹھ بجے ان کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پہلے سے ہی بہت سے احباب جماعت موجود تھے۔ جماعت کے سرکردہ عالم دین شیخ صلاح الدین مقبول احمد صاحب نے، جو کہ خلجی صاحب کے گہرے دوستوں میں تھے، نماز جنازہ پڑھائی۔ پہلے اعلان کیا گیا تھا کہ ان کی تدفین دہلی گیٹ کے قبرستان میں ہوگی۔ لیکن پھر انھیں قوم پنجابیان کے قبرستان میں دفن کرنے کا فیصلہ کیا گیا جو صرف پنجابی مسلمانوں کے لیے مخصوص ہے۔ وہاں ایک بار پھر نماز جنازہ ادا کی گئی۔ اس بار ان کے بیٹے محمد نے نماز پڑھائی۔ وہ ایک بہت بڑا قبرستان ہے اور وہاں کئی نامی گرامی ہستیاں مدفون ہیں۔ تدفین میں لاتعداد افراد نے شرکت کی۔ دہلی کے بھی اور بیرون دہلی کے بھی۔ مولانا عزیز عمر سلفی صاحب نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ وہیں شیخ الکل سید نذیر حسین محدث دہلوی بھی مدفون ہیں۔ حسن اتفاق، اسی گوشے میں خلجی صاحب کو بھی دفن کیا گیا۔ اب وہاں قبروں کے نشانات مٹ گئے ہیں۔ زمین برابر ہو گئی ہے۔

خلجی صاحب ادھر کافی دنوں سے صاحب فراش تھے۔ شوگر لیول بہت بڑھ گیا تھا۔ دل کا بھی عارضہ تھا اور فالج نے بھی حملہ کر دیا تھا۔ 30/ مارچ کو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک پروگرام کے بعد جب میں دہلی کے سرکردہ وکیل اور جماعت اہلحدیث کے ایک اہم فرد جناب فیروز غازی ایڈووکیٹ کے ساتھ نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد باہر نکلنے لگا تو وہیں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ میں استاد ڈاکٹر جنید حارث صاحب مل گئے۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ کو آپ کے گھر تک چھوڑ دیتا ہوں۔ لاکھ منع کرنے کے باوجود وہ نہیں مانے۔ ان کی گاڑی سے میں ذاکر نگر تک آیا۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ لیکن سوئے اتفاق خلجی صاحب کی کوئی بات نہیں آئی۔ دو روز کے بعد ایک اخبار میں خلجی صاحب کی خبر مع تصویر شائع ہوئی۔ جس سے معلوم ہوا کہ انھیں گوڑ گاؤں کے آرٹمیس اسپتال میں داخل کرایا گیا ہے۔ اس سے قبل انھیں دہلی گیٹ پر واقع جی بی پنت اسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ لیکن وہاں کوئی افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ تصویر میں ڈاکٹر جنید حارث بھی تھے۔ میں نے ان کو فون کیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہی ان کو گوڑ گاؤں کے اسپتال میں داخل

کر کے آئے ہیں اور اب پھر دیکھنے جائیں گے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ جب بھی جائیں تو مجھے ضرور لے چلیں۔ اتفاق دیکھیے کہ ڈاکٹر جنید حارث ہی ان کی تدفین میں شریک نہیں ہو سکے۔

ہوا یوں کہ انھی تاریخوں میں مولانا مطیع الرحمان صاحب کے ادارے توحید ایجوکیشنل ٹرسٹ کشن گنج بہار کے تحت وہاں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے 12/اور 13/اپریل کو دو روزہ بین الاقوامی سمینار منعقد ہو رہا تھا جس میں شیخ صلاح الدین مقبول احمد اور ڈاکٹر جنید حارث سمیت متعدد علماء و ادبی شخصیات شریک ہو رہی تھیں۔ (اسی موقع پر اردو کونسل کی جانب سے وہاں 7/سے 15/اپریل تک ایک کتاب میلہ بھی لگا تھا۔) شیخ صلاح الدین صاحب کا پہلے سے واپسی کا پروگرام تھا اس لیے وہ تدفین میں پہنچ گئے تھے۔

مولانا عبد الوہاب خلجی صاحب سے میرے تعلقات اسی وقت سے تھے جب میں مستقل طور پر دہلی آگیا تھا۔ اُردو بازار جامع مسجد پر واقع جمعیت اہلحدیث کے دفتر اہلحدیث منزل میں ہماری خاصی آمد و رفت تھی۔ ایک تو جماعتی وابستگی اور دوسرے ہمارے علاقے کے ایک عالم دین مولانا ابوالوفا صاحب کی جمعیت میں بحیثیت داعی تقرری۔ وہ جمعیت منزل کے ایک کمرے میں رہائش پذیر تھے۔ میں ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ یہ غالباً 1990 کی بات ہے۔ خلجی صاحب جمعیت اہلحدیث کے ناظم عمومی کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ کس نے ان سے ملاقات کرائی تھی لیکن ان کے دفتر میں ہونے والی پہلی ملاقات آج تک ذہن کے پردے پر نقش ہے۔ ملاقات کرانے والے نے ہم لوگوں کی جماعتی وابستگی کے بارے میں تو بتایا ہی، ساتھ ہی ہمارے والد حضرت مولانا حامد الانصاری انجم کے بارے میں بھی بہت سی باتیں ان کے گوش گزار کی تھیں۔

انھیں جب اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ میں اردو کا صحافی ہوں تو وہ بہت خوش ہوئے اور انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں ”جریدہ ترجمان“ میں مستقل لکھا

کروں۔ اس وقت اس کے ایڈیٹر سینئر صحافی جناب سلیمان صابر صاحب تھے۔ وہ روزنامہ قومی آواز سے سبکدوش ہو چکے تھے اور ترجمان کی ادارتی ذمہ داری نبھا رہے تھے۔ خلجی صاحب نے ایک طرح سے مجھے حکم دیا کہ میں ہر شمارے میں لکھوں۔ اس وقت ترجمان میں ایک مستقل کالم ''آئینۂ ایام'' شائع ہوتا تھا جسے سلیمان صابر صاحب لکھا کرتے تھے۔ خلجی صاحب نے ان سے کہا کہ اب یہ کالم سہیل انجم لکھیں گے۔ میں نے وہ کالم شروع کر دیا۔ خلجی صاحب نے میرے پہلے کالم پر ایک بہت اہم نوٹ لگایا اور میرے بارے میں لکھا کہ یہ جماعت کے ایک نوجوان صحافی ہیں اور اب یہ کالم یہی لکھا کریں گے۔ انھوں نے اس نوٹ کے ذریعے میری بڑی قدر افزائی کی۔ میں نے کافی دنوں تک لکھا۔ لیکن چونکہ اس وقت میں نیا نیا صحافت کے میدان میں آیا تھا اس لیے میری تحریر بڑی ناپختہ تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہر نئے صحافی کے مانند میں بھی خود کو بہت بڑا صحافی سمجھتا تھا۔ چند کالموں کے بعد سلیمان صابر صاحب نے بوقت ضرورت قلم چلانا اور ایڈٹ کرنا شروع کر دیا۔ کوئی ایک آدھ کالم شائع بھی نہیں ہوا۔ بس اسی بات پر میں نے کالم بند کر دیا۔ بعد میں صحافتی تجربات سے اندازہ ہوا کہ اس قسم کی تراش خراش مضمون کو بہتر بنانے کے لیے ناگزیر ہوتی ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ کسی کی ہر تحریر شائع ہی ہو۔ اخبارات کی بہت سی مجبوریاں بھی ہوتی ہیں۔ لیکن میری ناتجربہ کاری کی وجہ سے سلیمان صابر صاحب کی یہ ادا مجھے پسند نہیں آئی۔ جب کئی شماروں میں میرا کالم نہیں چھپا تو ایک ملاقات میں خلجی صاحب نے پوچھ لیا۔ میں خاموش تھا۔ کیا جواب دیتا۔ انھوں نے از راہ شکایت یہ بات کہی اور بجا طور پر کہی کہ جناب ہم نے آپ کے بارے میں اتنا اچھا نوٹ لگایا تھا اور آپ نے لکھنا بند کر دیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ کچھ دنوں کے بعد سلیمان صابر صاحب کا بھی انتقال ہو گیا اور مولانا ابوالوفا صاحب کو بھی فارغ کر دیا گیا۔

ویسے جریدہ ترجمان کو میں پہلے سے ہی پسند کرتا تھا اور اس کی وجہ اس کے سابق مدیر جناب بدر عظیم آبادی کا اداریہ تھا۔ ان کا انداز بہت شگفتہ تھا۔ مجھے ان کا اداریہ بہت پسند تھا۔ اس وقت بھی میں جمعیت منزل جایا کرتا تھا۔ مولانا عزیز عمر سلفی صاحب کے ساتھ

میں جامعہ نگر کے غفور نگر میں واقع ان کی رہائش گاہ بھی جا چکا تھا۔

خلجی صاحب نے ان دنوں موری گیٹ پر ''دار العلمیہ'' نام سے ایک اشاعتی ادارہ قائم کیا تھا۔ لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکا اور بعد میں انھیں اسے بند کر دینا پڑا۔ پھر ان کو جمعیت کی نظامت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ ماہنامہ نوائے اسلام کے مئی 2018 کے شمارے میں شائع مولانا عزیز عمر سلفی کے اداریہ کے مطابق ''خلجی صاحب کے پاس جمعیت کی نظامت اور دفتر میں مستقل قیام کی مدت 17 سال رہی''۔ ان کے دور نظامت میں ''حرمت حرمین کنونشن'' کا انعقاد کیا گیا اور حفظ قرآن و احادیث کے مسابقے شروع ہوئے۔

رفتہ رفتہ خلجی صاحب سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ پہلے وہ بلی ماران میں رہتے تھے۔ میں وہاں بھی جاتا رہا۔ انھی دنوں انھوں نے دریا گنج کے پٹودی ہاؤس میں ایک فلیٹ لے لیا۔ اس وقت میں سابق ایم پی و سابق سفارتکار جناب م۔ افضل صاحب کے اخبار ''اخبار نو'' سے جزوی طور پر وابستہ تھا۔ اس کا دفتر بھی وہیں پٹودی ہاؤس آ گیا تھا۔ لہٰذا خلجی صاحب سے ملاقاتیں تواتر سے ہونے لگیں۔ میں اسی علاقے میں واقع ''چھوٹی مسجد'' میں ظہر کی نماز ادا کرتا تھا۔ ایک روز خلجی صاحب بھی اسی مسجد میں مل گئے۔ کہنے لگے کہ چونکہ اس میں پون بجے نماز ظہر ہوتی ہے اس لیے میں اسی میں پڑھتا ہوں۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئے۔ چائے وغیرہ سے تواضع کی اور آتے رہنے کی ہدایت دی۔

جب بھی اخبار نو میں میرے پاس وقت ہوتا میں ان کو فون کرتا۔ اگر وہ گھر پر ہوتے تو ان سے ملنے چلا جاتا۔ ہمارے ایک مشترکہ دوست مولانا عبد اللہ مدنی جھنڈا نگری جب بھی دہلی آتے تو عموماً ان کے گھر ہی قیام کرتے۔ وہ جب وہاں قیام کرتے تو میں بھی جاتا اور پھر گھنٹوں گفتگو کا سلسلہ رہتا۔ دوپہر کے وقت کھانا بھی وہیں کھایا جاتا۔ اخبار نو کے منیجنگ ایڈیٹر اور میرے کرم فرما جناب مودود صدیقی صاحب کو جب خلجی صاحب سے میرے تعلقات کا علم ہوا تو انھوں نے کہا کہ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں ایک روز ان کو لے کر ان کے گھر گیا۔ کافی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ایک بار مولانا

عبداللہ مدنی صاحب بیمار پڑ گئے۔ وہ بھی عارضۂ قلب اور شوگر کی زیادتی میں مبتلا تھے۔ غالباً گوڑ گاؤں سے علاج کرا کے واپس آئے اور خلجی صاحب کے گھر انھوں نے قیام کیا۔ مجھے فون کیا اور میں اگلی صبح وہاں پہنچ گیا۔

ایسے مواقع بار بار آتے رہے۔ میری کوئی نئی کتاب آتی تو مجھے ان کے گھر جانے کا ایک بہانہ مل جاتا۔ ہمارے چھوٹے بھائی ڈاکٹر شمس کمال انجم کی ہمارے والد صاحب پر کتاب ''نقوش جاوداں'' اور پھر میری کتاب ''انجم تاباں'' آئی تو میں نے یہ دونوں کتابیں ان کی خدمت میں پیش کیں۔ نقوش جاوداں ختم کرنے کے بعد انھوں نے شمس کمال کو فون کیا اور بتایا کہ میں نے آپ کی کتاب پوری پڑھ لی ہے۔ ان دونوں کتابوں سے انھیں ہمارے والد کے بارے میں خاصی معلومات ہوئیں۔ مولانا عبداللہ مدنی صاحب سے ہمارے گھریلو مراسم رہے ہیں۔ انھوں نے بھی ہمارے والد صاحب کی جماعتی خدمات کے بارے میں ان کو بہت کچھ بتایا۔ پھر وہ مجھ سے بہت زیادہ محبت کرنے لگے تھے۔ اکثر کہتے کہ اپنے بچوں کو لے کر آؤ۔ ہمارے بچے ان سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ لیکن اس کا کوئی اتفاق ہی نہیں ہو سکا۔ حالانکہ وہ اپنی تقریبات میں مجھے بھی بلایا کرتے تھے۔ 2017 میں جب عالمی یوم اردو کی جانب سے ہمارے والد پر خصوصی مجلّہ شائع کیا گیا اور پھر اس سے قبل 2015 میں جب شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری پر مجلّہ شائع ہوا تو ان دونوں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے تھے۔ چونکہ امرتسری اور ان کا ایک ہی صوبے سے تعلق تھا اس لیے انھوں نے امرتسری پر خصوصی مجلّے کو کافی پسند کیا۔ بزرگ صحافی محفوظ الرحمٰن صاحب کا انتقال ہوا تو میرے پاس ان کا فون آیا۔ انھوں نے کہا کہ میں محفوظ صاحب کو تو پڑھتا رہا ہوں البتہ ان سے میری ملاقات نہیں تھی۔ ان کے انتقال سے مجھے بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ انھوں نے تدفین وغیرہ کے بارے میں پوچھا اور پھر تراہا بہرام خاں کی اس مسجد میں آئے جہاں نماز جنازہ ہونی تھی۔ اتفاق سے انھوں نے ہی نماز جنازہ پڑھائی۔

مولانا عبداللہ مدنی صاحب جھنڈا نگر نیپال میں اپنے ادارے میں سال میں کئی

کئی پروگرام منعقد کرتے تھے۔ وہ اپنے تمام دوستوں کو، بشمول خلجی صاحب، مدعو کرتے۔ میں بھی اکثر و بیشتر ان کے پروگراموں میں شریک ہوتا رہا ہوں۔ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ ایک پروگرام کے بعد اگلے روز ناشتے کے بعد دو گاڑیوں میں ہم لوگ وہاں سے واپس آرہے تھے۔ مولانا عبد اللہ مدنی اور مولانا خلجی صاحب کو ڈومریا گنج ضلع سدھارتھ نگر کے ایک پروگرام میں پہنچنا تھا جس میں جناب سید حامد وغیرہ بھی شرکت کر رہے تھے۔ مولانا مدنی صاحب کا گھر بالکل ہند نیپال سرحد کے قریب ہی ہے۔ ہم لوگ جب سرحد پر پہنچے تو وہاں کچھ نوجوان پولیس والے تعینات تھے۔ وہ سب کا سامان چیک کر رہے تھے۔ انھوں نے ہم لوگوں کی بھی گاڑی روکی اور سامان چیک کرنے لگے۔ ان میں سے ایک پولیس والا زیادہ تیز طرار تھا۔ وہ ہم لوگوں کو آگے جانے نہیں دے رہا تھا۔ اتنے میں دوسری گاڑی بھی آگئی جس میں خلجی صاحب موجود تھے۔ وہ لوگ گاڑی سے اتر آئے۔ انھوں نے پولیس والے سے پوچھا کیا بات ہے کیوں نہیں جانے دے رہے ہو۔ اس کے بعد جو پنجابی میں اس کو جھاڑا ہے تو وہ بری طرح بوکھلا گیا۔ اس نے ان کا لمبا قد، گورا چٹا چہرہ، شلوار قمیص اور سر پر اونچی مخملی ٹوپی اور فراٹے سے پنجابی بولتے دیکھا تو اس نے پتہ نہیں کیا سمجھا کہ فوراً وہاں سے بھاگ لیا۔ وہاں سے ہندوستانی سرحد کے اندر کچھ دور آنے کے بعد جو ہم لوگوں کی ہنسی چھوٹی ہے تو پھر کافی دیر تک سب ہنستے رہے۔ راستے میں کئی بار اس واقعہ کا تذکرہ ہوا۔ بہر حال ہم لوگ جب ڈومریا گنج پہنچے تو اس وقت سید حامد صاحب تقریر کر رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر کے بعد ان لوگوں سے اجازت لی اور پروگرام کے مطابق وہاں سے تقریباً چالیس پچاس کلو میٹر کی مسافت پر واقع اپنے گاؤں چلا گیا۔

میں نے اوپر ان کے اشاعتی ادارے دار العلمیہ کا ذکر کیا ہے۔ مولانا اس ادارے کے تحت ہر سال ایک ڈائری ''لیل و نہار'' شائع کرتے تھے۔ انھوں نے 2010 کی ڈائری مجھے دی اور اس پر کچھ لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اس پر تبصرہ لکھا جسے میں نے کئی اخباروں میں چھپوایا تھا۔ میں نے اس میں لکھا تھا:

"یہ ڈائری عام روش سے الگ ہٹ کر ہے اور اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ اسے مکمل طور پر ایک اسلامی ڈائری بلکہ ڈائرکٹری بنا دیا جائے۔ مثال کے طور پر اس میں قرآن کریم سے متعلق چند اہم معلومات، تفصیل حروف قرآن، چند مقامات نزول، خطبہ حاجہ، چند اہم فقہی اصطلاحیں، مسائل زکوۃ، نبی کریم کی پسندیدہ دعائیں، دینی درسگاہوں کا قیام اور علمائے حق کی مساعی، دائمی نقشہ پنج وقتہ نماز برائے دہلی واطراف، دین خالص کی ترجمان اہم ویب سائٹس وغیرہ تفصیلات بھی موجود ہیں۔ جبکہ عصری ضروریات کے تقاضوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مرکزی حکومت کے وزراء اور ان کے قلمدانوں کی تفصیل مع رہائشی ودفتری پتے اور فون نمبر، راجیہ سبھا اور لوک سبھا کے اہم فون نمبر، پندرہویں لوک سبھا میں مسلم ارکان ان کے حلقے رہائشی و دفتری فون نمبر، راجیہ سبھا میں مسلم ارکان کی تفصیل، مرکزی و ریاستی حج کمیٹیوں کے چیئرمین ان کے پتے مع فون نمبر، ریاستی اردو اکیڈمیوں کے چیئرمین اور سکریٹری کے پتے اور فون نمبر، سرکردہ مسلم شخصیات کے فون نمبر وغیرہ۔ اس میں سلفی عقیدہ ومنہج کا رنگ بھرنے کی بھی پوری کوشش کی گئی ہے۔ اسی لئے اس میں ہندوستان میں جماعت اہلحدیث کے ممتاز علماء اور احباب کے فون نمبر مع شہر دیے گئے ہیں۔ اس کے بعد دنیائے سلفیت کی چنندہ بین الاقوامی شخصیات کے فون نمبر بھی مع ملک اور شہر مہیا کیے گئے ہیں۔ ہر ماہ کی یومیہ مصروفیات کے لیے صفحات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ اس میں ایمان افروز منظومات کا بھی گراں قدر حصہ ہے اور ہر صفحے پر ایک حدیث اور خالص اسلامی فکر کا ایک شعر بھی دیا گیا ہے"۔

دارالعلمیہ کے زیر اہتمام شائع ہونے والی ڈائریوں پر مقتدر شخصیات وقتاً فوقتاً اظہار خیال بھی کرتی رہی ہیں۔ ان کی مختصر آراء بھی اس ڈائری میں موجود تھیں۔ اہم شخصیات میں مولانا عبدالرؤف رحمانی مرحوم، مولانا مختار احمد ندوی مرحوم، ڈاکٹر وصی اللہ

عباس مکہ، ڈاکٹر لقمان سلفی، شیخ صلاح الدین مقبول احمد، علامہ علیم ناصری لاہور، مولانا عبداللہ مدنی نیپال، م۔ افضل سفیر ہند برائے ترکمانستان، مولانا اسرار الحق قاسمی ایم پی، سید شہاب الدین سابق ایم پی، مولانا عمید الزماں کیرانوی، کنور شکیل احمد لندن اور مولانا عبداللہ مغیثی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ایک تو جھجک کی وجہ سے اور دوسرے یہ سوچ کر کہ پتہ نہیں ان کی طبیعت کیسی ہے، میں ان کو بہت کم کال کرتا تھا۔ وہی مجھے اکثر و بیشتر کال کرتے تھے۔ بعض اوقات تو ایک ایک گھنٹے تک گفتگو ہوتی رہتی۔ مختلف موضوعات زیر بحث آتے۔ لیکن زیادہ تر گفتگو یا تو جمعیت و جماعت کے تعلق سے ہوتی یا پھر مسلمانوں کی عام صورت حال پر یا پھر صحافت پر۔ وہ اکثر مسلمانوں کے موجودہ حالات پر رنج وغم کا اظہار کرتے۔ جب بھی میرا کوئی مضمون ان کو زیادہ پسند آجاتا تو مضمون ختم کرتے ہی فون کرتے اور خوشی کا اظہار کرتے۔ میں نے مولانا ثناء اللہ امرتسری کا جو قلمی خاکہ لکھا تھا وہ انھیں بہت پسند آیا تھا۔ بار بار اس کا تذکرہ کرتے رہے۔ احباب جماعت کے تعلق سے ایسی بہت سی معلومات مجھے ان سے حاصل ہوتیں جو دوسروں سے نہیں ملتیں۔ لیکن تمام قسم کی گفتگو کے دوران انھوں نے جماعت و جمعیت کے ذریعے اپنے ساتھ کیے جانے والے ''سلوک'' پر کبھی کوئی بات نہیں کی۔

خلجی صاحب کے اندر مسلکی غیرت وحمیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ ایک بار دار العلوم دیوبند میں قیام کے دوران کسی نے کوئی ایسی بات کہہ دی جوان کی مسلکی غیرت کے لیے تازیانہ تھی۔ انھوں نے وہیں دنداں شکن جواب دیا۔ یہ واقعہ انھوں نے خود مجھے بتایا تھا۔ ایک بار ایک ملی تنظیم کی جانب سے منعقدہ کانفرنس میں جماعت اہلحدیث کے خلاف کچھ نکات عمداً زیر بحث لائے گئے تھے۔ کانفرنس کے بعد مولانا خلجی نے ''اتحاد بین المسالک'' نام سے ایک کتابچہ شائع کیا۔ اس کے باوجود ان کے اندر مسلکی تعصب کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اس تعلق سے ان کا کردار مولانا ثناء اللہ امرتسری جیسا تھا۔ سب کے ساتھ دوستانہ وخیر سگالانہ مراسم۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسرے

مسلک کے لوگوں میں بھی مقبول تھے۔ ان کے مسلکی توسع اور ان کی بلند و بالا شخصیت کی وجہ سے ہی ڈاکٹر محمد منظور عالم نے ان کو آل انڈیا ملی کونسل میں باوقار جگہ دی تھی۔ وہ کئی حیثیتوں سے ملی کونسل میں خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ وہ تا زندگی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ میں جماعت اہلحدیث کی نمائندگی کرتے رہے۔ انھوں نے مسلم مجلس مشاورت اور دیگر ملی تنظیموں میں بھی خدمات انجام دیں۔ وہ جامعہ سلفیہ بنارس کی مجلس منتظمہ میں رہے۔ وہ عالمی اسلامی کونسل لندن اور اسلامک ایشین کونسل سری لنکا سے بھی منسلک رہے۔ سیاسی شخصیات سے بھی ان کے دوستانہ مراسم رہے ہیں۔ پاکستان میں متعدد علمی شخصیات سے ان کی دوستی رہی ہے۔ جب بھی وہاں سے ان کا کوئی دوست دہلی آتا تو وہ اس کے اعزاز میں تقریب کا اہتمام کرتے اور اس میں خاکسار کو بھی مدعو کرتے۔ انھیں مذہبی، ملی، سیاسی و سماجی پروگراموں میں بطور مقرر مدعو کیا جاتا اور ان کی باتیں بڑی سنجیدگی سے سنی جاتیں۔ ایسا بہت کم ہوتا کہ کسی ملی تنظیم کی جانب سے منعقد ہونے والے کسی پروگرام میں انھیں اسٹیج پر جگہ نہ دی گئی ہو۔ لیکن وائے افسوس کہ اُسی جماعت نے ان کی قدر نہیں کی جس سے ان کا خاندانی اور جذباتی رشتہ رہا ہے اور جس کی انھوں نے بیش بہا خدمت کی تھی۔

اِدھر کچھ برسوں سے وہ بیمار رہنے لگے تھے۔ کافی کمزور ہو گئے تھے۔ پروگراموں میں بہت کم جاتے۔ ایک طرح سے وہ مایوسی کے بھی شکار تھے۔ ان کا اشاعتی ادارہ کافی پہلے ناکامی سے دوچار ہو کر بند ہو چکا تھا۔ کہیں آنے جانے میں کچھ نہ کچھ تو صرف ہوتا ہی ہے۔ اس کا احساس مجھے ایک بار بڑی شدت سے ہوا تھا جس کی تفصیل میں جانا ضروری نہیں۔ ان پر جمعیت میں مالی بدعنوانی کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ لیکن مجھے بڑی حیرت ہے کہ انھوں نے کیسی مالی بدعنوانی کی تھی کہ نظامت کا تاج چھنتے ہی تنگدستی کے شکار ہو گئے۔ امور مملکت خویش خسرواں دانند! لیکن انتہائی سخت حالات کے باوجود انھوں نے اپنی دستار غیرت سنبھالے رکھی۔ ان کے حقیقی حالات کا علم بہت کم لوگوں کو تھا۔ انھوں نے کبھی کسی کے سامنے اپنے حالات واشگاف نہیں کیے۔

مقام افسوس ہے کہ جماعت کی اتنی بڑی اور مقتدر شخصیت ہمارے درمیان سے اٹھ گئی اور ہمیں اس کا احساس ہی نہیں ہے کہ ہم نے کیا کھو دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسرے مکاتب فکر کے درمیان جماعت اہلحدیث کا ایک نمائندہ اور ایک سفیر جماعت اپنی نشست خالی کر کے چلا گیا۔ کوئی دوسرا ایسا نظر نہیں آتا جو اس نشست کو پُر کرنے کا اہل ہو۔ ان کے انتقال کے بعد ان کی یاد میں کوئی پروگرام بھی منعقد نہیں کیا گیا۔ اپنی جماعت کا یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ بڑے لوگوں کے بھی اٹھ جانے کے بعد ان کو یاد کرنے کی کوئی روایت نہیں ہے۔ اگر کوئی کچھ سیمنار یا تعزیتی نشست کرنا بھی چاہے تو اسے بدعت کہہ کر مسترد کر دیا جاتا ہے۔ اپنے اسلاف کی بے قدری کا یہ عالم جماعت کی بے حسی پر ماتم کناں ہے۔ خلجی صاحب کے انتقال کے آس پاس ہی تین مزید شخصیات دنیا سے اٹھ گئیں۔ مولانا محمد سالم قاسمی، جسٹس راجندر سچر اور دہلی کے ایک معروف وکیل سالار محمد خاں۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کے چیئر مین ڈاکٹر منظور عالم نے ان شخصیات کی یاد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سی آئی ٹی ہال میں ایک مشترکہ تعزیتی اجلاس منعقد کیا تھا۔ انھوں نے مرحومین میں خلجی صاحب کو بھی شامل کیا تھا۔ یہ واقعہ جماعت اہلحدیث کے افراد کے لیے کسی تازیانے سے کم نہیں۔

اپریل 2018

OO

حفیظ نعمانی

حفیظ نعمانی صاحب کے مضامین تو میں پڑھتا رہا ہوں مگر ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی نہ ہی کبھی گفتگو کا موقع ملا تھا۔ دو تین سال قبل دہلی کے روزنامہ جدید خبر میں ان کے ایک مضمون کا عنوان دیکھا تو چونک گیا۔ عنوان تھا ''میں آخری جمعہ ہوں مگر الوداع نہیں''۔ اس سال جمعۃ الوداع کے بارے میں شکوک وشبہات تھے۔ مسلمانوں نے جس جمعہ کو جمعۃ الوداع کی حیثیت سے منایا وہ رمضان المبارک کا آخری جمعہ تھا ہی نہیں۔ اس کے بعد کا جمعہ آخری جمعہ تھا۔ اس لحاظ سے مضمون کا عنوان بڑا ہی پرکشش اور غور وفکر کو دعوت دینے والا تھا۔ میں نے فوراً پورا مضمون پڑھا۔ ان کے خیالات جان کر بڑی خوشی ہوئی۔ اس میں انھوں نے جمعۃ الوداع کے بارے میں مسلمانوں کے جمہور طرز فکر پر گفتگو کی تھی اور یہ سوال اٹھایا تھا کہ جمعۃ الودع کا تصور کہاں سے آیا۔ مضمون پڑھنے کے بعد میں خود کو نہیں روک سکا۔ نیچے ان کا موبائل نمبر درج تھا۔ فوراً ان سے گفتگو کی۔ ان کی آواز اور اندازِ گفتگو نے دل میں گھر کر لیا۔ یوں لگا جیسے میں ان کا بہت پرانا شناسا ہوں۔ انھوں نے بڑی اپنائیت، بڑی محبت اور بڑی گرمجوشی سے بات کی۔ کم وبیش دس منٹ کی گفتگو نے دل کو ان کا گرویدہ بنا دیا۔ تحریر نے تو پہلے ہی بنا لیا تھا۔ یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ موجودہ صحافت کے بارے میں میری ناقص رائے ان کی رائے سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اس کے بعد جب بھی میں ان کا کوئی مضمون پڑھتا تو طبیعت گفتگو کے لیے بے چین ہو جاتی۔ کبھی کبھار ہمت کر کے فون بھی کر لیتا۔ ایک روز انھوں نے بڑے درد و کرب کے ساتھ کہا کہ ''سہیل انجم تم آ کر مجھے دیکھ جاؤ۔ میں پکا ہوا آم ہوں۔ جانے

کب شاخ سے ٹپک جاؤں''۔ طبیعت مضطرب ہوگئی۔ انھوں نے بڑی ہی فراخ دلی کے ساتھ یہ بھی کہا کہ تم کو جتنے روز لکھنؤ میں رہنا ہو میرے ہوٹل میں رہنا۔ میری گاڑی تمھارے لیے کھڑی رہے گی۔ جہاں جانا چاہو گے ڈرائیور لے جائے گا۔ آنکھیں نم ہو گئیں۔ ایسی اپنائیت تو ان سے بھی نہیں ملتی جن سے برسوں کی شناسائی ہو۔ یہاں معاملہ یہ تھا کہ ہم کبھی ملے ہی نہیں تھے۔ مگر میں اس وقت چاہ کر بھی لکھنؤ نہیں جا سکا۔

جانے کا اتفاق ہوا تو ایسے ہنگامی حالات میں کہ میں ان کے دولت خانہ پر صرف ایک بار جا کر نیاز حاصل کر سکا۔ ہوا یوں کہ اسی سال اکتوبر کے مہینے میں میرے بڑے بھائی حماد انجم ایڈووکیٹ ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہو گئے۔ انھیں لکھنؤ کے ایک اسپتال میں داخل کرایا گیا۔ میں دہلی سے لکھنؤ گیا۔ وہاں ان کی تیمارداری کرنے کے لیے میری بھابھی، ایک بھتیجہ اور ایک بہن تھی۔ وہاں یہ جان کر بڑی تشویش ہوئی کہ اسپتال کے آس پاس رہنے کی کوئی معقول جگہ نہیں۔ میں بھی لکھنؤ سے بہت کم واقف۔ سہ پہر کے تین بج گئے تھے۔ یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ شام ہونے والی ہے۔ پھر رات ہو جائے گی کہاں رہیں گے۔ کم از کم ان بچوں کے لیے رہائش کا انتظام تو کرنا ہی پڑے گا۔ فوری طور پر حفیظ نعمانی صاحب یاد آگئے۔ میں نے ہمت کر کے ان کو فون کیا۔ ان کو پوری صورت حال بتائی اور درخواست کی کہ مسلم مسافر خانہ میں رہنے کا انتظام کروا دیجیے۔ انھوں نے پوری بات سننے کے بعد کہا کہ اچھا میں ابھی آپ کو فون کرتا ہوں۔ میں نے سوچا کہ مسلم مسافر خانہ والوں سے کوئی بات کریں گے۔ دل مطمئن ہو گیا۔ مگر پانچ منٹ کے بعد جب ان کا فون آیا تو انھوں نے کہا کہ آپ مسافر خانہ میں کیوں رہیں گے۔ آپ بچوں کے ساتھ میرے ہوٹل میں رہیے۔ میں نے منیجر صاحب کو بتا دیا ہے۔ یہ ہوٹل کا نمبر ہے۔ آپ جب وہاں جانا چاہیں ان کو بتا دیں۔ مگر ایک دشواری ہے۔ میں نے کہا کیا دشواری ہے۔ خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہے۔ انھوں نے کہا کہ نہیں کوئی گڑبڑ نہیں۔ آپ چار لوگ ہیں اور میرے ہوٹل میں صرف ایک ڈبل بیڈ کا کمرہ خالی ہے۔ میں نے جھٹ سے کہا کہ کوئی بات نہیں۔ ہم ایڈجسٹ کر لیں گے۔ انھوں نے ازراہ محبت یہ بھی کہا کہ میں تو

ڈیڑھ ٹانگ کا آدمی ہوں ورنہ اسپتال آکر آپ کے بھائی کی عیادت کرتا۔ میں نے یہ سوچتے ہوئے کہ ڈیڑھ ٹانگ سے ان کی کیا مراد ہے، فوراً منیجر صاحب کو فون کیا۔ انھوں نے بتایا کہ ہاں حفیظ نعمانی صاحب نے آپ کے بارے میں بتا دیا ہے۔ آپ جب چاہیں آجائیں۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں ان کا ہوٹل مہنگا نہ ہو ان سے پوچھ لیا کہ کمرے کا چارج کیا ہے۔ انھوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتا۔ بس جب آپ آنا چاہیں آجائیں۔

ہم لوگ رات میں نو دس بجے ان کے ہوٹل ''ردا کانٹی ننٹل'' پہنچے۔ فوراً نعمانی صاحب کا فون خیریت معلوم کرنے کے لیے آیا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے حالات سے آگاہ کرتے رہیے گا۔ میں نے دن ہی میں اپنے ایک پرانے دوست سمیع اللہ قمر صاحب کو جو کہ اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا کے کارکن ہیں اور مولانا آزاد اردو یونیورسٹی لکھنؤ میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عمیر منظر صاحب کو فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی اور ان لوگوں کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حفیظ نعمانی صاحب کے ہوٹل میں قیام ہے۔ ان سب نے نعمانی صاحب کا نام سنتے ہی بڑے احترام کے ساتھ گفتگو کی اور کہا کہ وہ تو شہر کے بڑے معزز لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اگلی صبح کو میں نے بچوں کو اسپتال بھجوایا اور مذکورہ دوستوں کا انتظار کرنے لگا۔ پہلے ڈاکٹر عمیر منظر روزنامہ اودھ نامہ کے ایک کارکن احسن ایوبی کے ساتھ تشریف لائے۔ اس کے بعد سمیع اللہ قمر اور ایک اور دوست محمد راشد تشریف لائے۔ وہ بھی اردو سہارا کے کارکن ہیں۔ میں نے حفیظ نعمانی صاحب کو ان سے ملاقات کی اپنی خواہش کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ان دونوں کے ساتھ میں نعمانی صاحب کے دولت خانے پر گیا۔ انھوں نے انتہائی گرمجوشی کے ساتھ ملاقات کی۔ میں نے خیریت دریافت کی تو کہنے لگے:

''بس طبیعت تو ٹھیک نہیں ہے البتہ میں نے اسے ٹھیک کر رکھا ہے''۔

ایک قہقہہ بلند ہوا جس میں وہ بھی شریک رہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ واکر کے سہارے چل رہے ہیں۔ اب ان کی ڈیڑھ ٹانگ والی بات کا معمہ حل ہو گیا۔ میں نے اس

بارے میں پوچھا تو کہنے لگے کہ ایک حادثے میں میری ران کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ دو بار آپریشن کرا چکا ہوں۔ میں نے اپنے ڈاکٹر سے کہا کہ ایک بار اور آپریشن کرانے کا حوصلہ ہے۔ اس پر ڈاکٹر نے جواب دیا کہ آپ کی کڈنی کو حوصلہ نہیں ہے۔ اب آپ اسی پر قناعت کیجیے۔ دوائیں لیجیے۔ صحت بخش کھانا کھائیے۔ موسم کے پھل کھائیے۔ خوش رہنے کی کوشش کیجیے۔ میں ڈاکٹر کا اسی طرح فرماں بردار ہوں جس طرح کوئی مرید اپنے پیر کا ہوتا ہے۔

میں نے پوچھا کہ بار بار آپریشن کرانے کی ضرورت کیوں پڑتی ہے، آپریشن کے بعد پلیٹ تو لگائی گئی ہوگی۔ اس پر انھوں نے ایسا جملہ ادا کیا کہ زبان کا لطف آگیا۔ انھوں نے کہا: ''ران کی ہڈی میں کوئی انفیکشن ہے جس کی وجہ سے اسٹیل کی پلیٹیں بسکٹ کی طرح ٹوٹ جاتی ہیں''۔ یہ بات انھوں نے اس پر لطف انداز میں کہی کہ ایک بار پھر قہقہہ بلند ہوا۔ بہت سے موضوعات پر گفتگو ہوئی۔ سیاست، صحافت، ملت اور دوسرے موضوعات پر۔ ہر معاملے پر ان کی رائے ایسی نپی تلی اور متوازن کہ آپ اس سے اختلاف تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کا وقت یوں گزر گیا جیسے ہوا کا کوئی خوشگوار جھونکا آ کے چلا جائے۔ چلتے چلتے انھوں نے ایک عنایت اور کی۔ محمد اویس سنبھلی کی مرتب کردہ کتاب ''بجھے دیوں کی قطار'' جو کہ ان کے مضامین سے ایک خوبصورت انتخاب ہے اور اپنی جیل ڈائری ''روداد قفس'' عنایت کی۔ روداد قفس کی کچھ قسطیں میں نے روزنامہ اودھ نامہ میں پڑھ رکھی تھیں۔ اس کتاب کو پڑھنے کی بڑی خواہش تھی۔ لیکن اتفاق سے اس کا اُردو ایڈیشن ختم ہو گیا تھا۔ انھوں نے ہندی ایڈیشن دیتے ہوئے پوچھا کہ ''ہندی آپ پر گراں تو نہیں''۔ میں نے کہا کہ نہیں۔ مومنوں پر تو بقول علامہ اقبال صبح کی بیداری ہی گراں گزرتی ہے باقی کچھ نہیں۔ میں بھی مومن ہوں اور علامہ کی بات کی تائید کرتا ہوں۔ دوسروں کے ساتھ وہ بھی مسکرانے لگے۔ اویس سنبھلی نے پہلے ہی راشد صاحب سے کہہ دیا تھا کہ سہیل انجم کو دونوں کتابیں دلوا دیجیے گا۔

دونوں کتابیں میں اپنے ساتھ اسپتال لے گیا۔ بجھے دیوں کی قطار کے دو مضامین وہیں پڑھ ڈالے۔ کچھ مضامین رات میں ہوٹل میں پڑھے۔ چند باقی مضامین

دہلی واپس آنے کے بعد پڑھے۔ اس کو ختم کرنے کے بعد روداد قفس کا مطالعہ کیا۔ جب لکھنؤ سے واپسی کا وقت آیا تو میں نے صبح کے وقت فون کر کے بتا دیا کہ آج اور ابھی میں چیک آؤٹ کر جاؤں گا جو ادائیگی کرنی ہو وہ آپ مجھے یا کاؤنٹر پر بتا دیجیے۔ انھوں نے کہا کہ میں ابھی کاونٹر پر کہہ دیتا ہوں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہوٹل کے کارکن مشتاق آئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مجھے کتنی ادائیگی کرنی ہے ذرا کاونٹر سے پوچھ کر بتا دو۔ انھوں نے کہا کہ آپ کو کچھ بھی نہیں دینا ہے۔ ابھی ''ابو صاحب'' کا فون آیا تھا انھوں نے کچھ بھی لینے سے منع کر دیا ہے۔ آپ تو ابو صاحب کے مہمان تھے آپ سے چارج تھوڑی لیں گے۔ انھوں نے پھر ہوٹل آنے کی فرمائش کر کے مجھے رخصت کیا۔

میں نے فوراً نعمانی صاحب کو فون کیا اور دل کی گہرائیوں سے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے بڑی ہی خاکساری اور انکساری کے ساتھ کہا کہ مجھے تو افسوس یہ ہے کہ میں کسی دن آپ کو اپنے گھر پر بلا کر آپ کی خدمت بھی نہیں کر سکا۔ میں نے ان کے محبت آمیز سلوک کا پھر شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ نے اپنی محبت و اپنائیت کا جو تحفہ دیا ہے وہ میرے لیے بیش قیمت ہے۔ میں نے یہ بھی بتایا کہ میں نے آپ کی کتاب کے کئی مضامین پڑھ لیے ہیں اور خاص طور پر آپ نے اپنی اہلیہ کے انتقال پر جو دلگداز مضمون لکھا ہے اس نے آبدیدہ کر دیا۔ بہت خوش ہوئے اور جذباتی بھی۔ بار بار یہی دوہراتے رہے کہ میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکا۔ میں ان کے اس محبت آمیز سلوک کے بوجھ تلے دبا ہوا وہاں سے دہلی آ گیا۔ لیکن چلتے چلتے وہ اس بات کی تلقین کرتے رہے کہ بھائی کی خیریت سے آگاہ کرتے رہنا اور میرے لائق جو بھی ہو گا مجھے یاد کرنا۔

بجھے دیوں کی قطار کے فوراً بعد میں نے روداد قفس بھی پڑھ ڈالی۔ ان دونوں کتابوں کے مطالعہ کا سرور کئی دنوں تک حواس پر چھایا رہا۔ طبیعت کچھ لکھنے کو بے چین تھی۔ اسی درمیان دہلی سے شائع ہونے والے روزنامہ اخبار ''روزنامہ خبریں'' کے ایڈیٹر اور ہمارے دیرینہ رفیق قاسم سید نے کتابوں پر تبصرے لکھنے کی فرمائش کی۔ مجھے موقع مل گیا اور میں نے فوری طور پر ''بجھے دیوں کی قطار'' پر ایک تبصرہ لکھ کر دے دیا۔ اسی درمیان

اویس سنبھلی کا فون آیا کہ وہ حفیظ صاحب پر ایک کتاب ترتیب دے رہے ہیں جس میں ان کی کتابوں پر تبصرے بھی شامل کریں گے۔ میں نے ان کو وہ تبصرہ میل کر دیا۔ دو تین روز کے بعد حفیظ صاحب کا فون آیا۔ کہنے لگے کہ ''آپ نے مجھے جس طرح سے نوازا ہے میں اس کا مستحق نہیں ہوں۔ میں بہت شرمندہ ہوں''۔ میں نے پوچھا آپ کیا کہہ رہے ہیں میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ کہنے لگے کہ ''تم نے بجھے دیوں کی قطار پر جو مضمون لکھا ہے میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ میں نے تمھیں کتاب تبصرہ لکھنے کے لیے تھوڑی دی تھی''۔ میں نے کہا کہ ہاں اویس صاحب نے آپ کے بارے میں کتاب ترتیب دینے کا ذکر کیا تو میں نے ایک اخبار کے لیے لکھے ہوئے اپنے مضمون میں کچھ اضافہ کر کے ان کے پاس بھیج دیا ہے۔ کیا آپ نے اسے دیکھ لیا۔ کہنے لگے کہ ''ہاں صبح اودھ نامہ اخبار کھولا تو اس میں وہ مضمون چھپا ہوا ہے''۔ پھر اپنے مخصوص انداز میں بار بار کہتے رہے کہ بھائی میں ایسی چیزوں سے بہت نادم ہوتا ہوں۔ میں اس لائق نہیں کہ کوئی میرے اوپر مضمون لکھے، کتاب لکھنے کی بات تو بہت دور کی ہے۔ میں خود کو اس کا اہل نہیں پاتا۔ میں نے اسے ان کی انکساری و خاکساری پر محمول کیا اور ان سے کہا کہ آپ جیسے صحافی اب کہاں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ آپ کے قلم میں کیا جادو ہے۔ آپ کی تحریر کے مداحوں کی کتنی بڑی تعداد ہے۔ کہنے لگے کہ نہیں اب اس قسم کی تحریریں پڑھنے والے نہیں رہ گئے۔ میں نے کہیں لکھا ہے کہ حفیظ نعمانی جیسے صحافی اب پیدا نہیں ہوتے۔ حق گوئی و بیباکی جن کی شان ہو اور حرص و طمع سے دشمنی جن کا ایمان اب خال خال ملیں تو ملیں ورنہ وہ بھی نہیں۔ وہ جتنے اچھے صحافی ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔ اب تک کی گفتگو سے ان کی انسان دوستی اور شرافت نفسی کا اندازہ لگ گیا ہوگا۔ ان کی بیباک صحافت کے گواہ ندائے ملت، عزائم، ان دنوں اور اودھ نامہ جیسے اخبارات کے صفحات ہیں۔ ابھی حال ہی میں انھوں نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں اس سال پیش آنے والے واقعات پر ہلکی سی روشنی ڈالی ہے۔ مضمون میں انھوں نے نریندر مودی کے الیکشن کے بارے میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''نریندر مودی نے اکیلے دم پر صرف کانگریس کا ہی نہیں اپنی ہر مخالف پارٹی کا صفایا کر دیا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کے پاس سب سے بڑا ہتھیار جھوٹ تھا۔ انھوں نے جھوٹ کے علاوہ کوئی ہتھیار استعمال نہیں کیا''۔ ان جملوں میں جہاں انتہائی بیباکی و بے خوفی کا مظاہرہ کیا گیا ہے وہیں بڑے نپے تلے انداز میں بات بھی کہی گئی ہے۔ اور اتنے سلیقے سے کہی گئی ہے کہ ان کے یہ جملے فوراً دل میں اتر جاتے ہیں۔ ان کی تحریریں آج کے صحافیوں کے لیے مشعل راہ ہیں۔ مگر موجودہ صحافت کی بدقسمتی یہ ہے کہ نئے صحافی تو بہت آگئے ہیں لیکن وہ کچھ سیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ بلکہ وہ خود کو ہی سب سے بڑا صحافی سمجھتے ہیں۔

حفیظ نعمانی صاحب کی بیباک صحافت کا مشاہدہ کرنا ہو تو ہفت روزہ ندائے ملت کے دور کو یاد کیجیے۔ خاص طور سے اس وقت جب مسلم یونیورسٹی نمبر نکالنے پر حکومت نے انھیں جیل میں ڈال دیا تھا۔ 1965 میں حکومت کی جانب سے مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو ختم کرنے کے لیے آرڈیننس جاری کیا گیا تھا۔ اس وقت کے وزیر تعلیم کریم بھائی چھاگلہ تو یونیورسٹی کے نام سے لفظ مسلم ہی نکالنے پر بضد تھے۔ حفیظ نعمانی نے ندائے ملت کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اس کی مخالفت کی اور ایک نمبر نکالنے کا اعلان کیا۔ ان کے اعلان سے حکومت کے ایوانوں میں جیسے زلزلہ آگیا۔ اس پر پابندی لگا دی گئی۔ لیکن انھوں نے تمام تر خطرات مول لے کر نہ صرف یہ کہ اسے چھاپا بلکہ اعلان شدہ تاریخ اشاعت سے قبل ہی اس کی پانچ ہزار کاپیاں علیگڑھ بھجوا دیں۔ بہر حال پولیس نے ان کے دفتر پر چھاپہ مارا اور اخبار کی جو کاپیاں ملیں انھیں ضبط کر لیا گیا۔ پھر انھیں مزید دو رفقائے کار کے ساتھ گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا۔ تینوں نو ماہ تک جیل میں رہے۔ انھیں اس کا اندازہ تھا کہ حکومت ان کے ساتھ کچھ بھی کر سکتی ہے لیکن انھوں نے ندائے ملت کے مسلم یونیورسٹی نمبر کی اشاعت کا پروگرام کالعدم نہیں کیا۔ جیل کی سختیاں برداشت کیں لیکن ملت کے ایک کاز کو معمولی سا بھی نقصان پہنچ جائے اس کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔

جیل سے رہائی کے بعد انھوں نے ''روداد قفس'' نام سے جیل ڈائری لکھی جو

بے حد مقبول ہوئی۔ اس میں صرف اور صرف جیل کے اندر کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ جیل میں قیدیوں کے ساتھ کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ کیسا کھانا دیا جاتا ہے۔ کس طرح خود جیل کے افسران اعلیٰ جیل کے قوانین کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کس طرح جیل کے اندر مسلم اور غیر مسلم قیدیوں میں امتیاز برتا جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کی تفصیل اس کتاب میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے کس طرح جیل میں رمضان کے دوران نماز تراویح میں قرآن کریم سنایا اور کیسے عید کے روز انھوں نے اپنے والد حضرت مولانا منظور نعمانی صاحب کے لیے نماز عید کی امامت کا انتظام کروایا۔ یہ کتاب روداد جیل تو ہے ہی خوبصورت زبان میں لکھی ہوئی ایک داستان بھی ہے۔ اگرچہ حفیظ نعمانی صاحب نے تمام سچے واقعات ہی بیان کیے ہیں لیکن پیرایہ بیان اتنا پر لطف اور پر کشش ہے کہ اگر وہ یہ کہہ دیں کہ یہ ایک تخیلاتی کہانی ہے تب بھی لوگ اس بات پر یقین کر لیں گے۔ کیونکہ اس میں جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اس کے ذریعے حقائق کی معروضی پیشکش تو ہے ہی اس میں افسانوی لطف و انبساط بھی ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو کہ انھوں نے جن باتوں کا انکشاف کیا ہے وہ قارئین کے لیے تخیلاتی قسم کے ہی ہوں۔ مثال کے طور پر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ عید کی نماز اور خطبہ کے لیے بمشکل نصف گھنٹے کا وقت دیا جائے اور سنگینوں کے سائے میں نماز دوگانہ ادا ہو اور ہولی کا پورا دن چھٹی، موج مستی، غل غپاڑہ اور تمثیلی ڈراموں اور دیگر فضولیات میں گزر جائے اور کسی افسر کا کہیں پتہ نہ ہو۔ بلکہ ڈرامہ اور ہولی کھیلنے کے لیے ضروری تمام چیزیں حکام ہی نے فراہم کی ہوں۔ یہ تمام باتیں جس انداز میں لکھی گئی ہیں ان کی روشنی میں پورے ملک کی جیلوں کے حالات میں سدھار لایا جا سکتا ہے۔

جب یہ جیل ڈائری اخبار میں شائع ہونے لگی تو اس کے قارئین اگلی قسط کا انتظار کرنے لگے۔ یہ جیل ڈائری کی مقبولیت نہیں تو اور کیا ہے کہ مولانا عبد الماجد دریابادی کے اخبار ''صدق جدید'' میں اسے نقل کیا جائے اور ندائے ملت میں اس کی قسطیں پڑھ کر معروف مجاہد آزادی، صحافی اور ادیب قاضی محمد عدیل عباسی اس بارے میں حفیظ

نعمانی کو تعریفی خطوط لکھیں۔

حفیظ صاحب کی تحریروں کی کئی خصوصیات ہیں۔ بقول پروفیسر شارب ردولوی ''حفیظ کی تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا اسلوب اور زبان ہے۔ عربی و فارسی کے اپنے پس منظر کے باوجود وہ بے حد نفیس زبان لکھتے ہیں۔ ان کی تحریر میں ایسی اپنائیت اور خلوص ہے...... کہ ہر شخص کو ان کا قائل ہونا پڑتا ہے''۔ دراصل ان کی تحریر ہی میں اپنائیت اور خلوص نہیں ہے بلکہ ان کی شخصیت اور ان کی گفتگو میں بھی ہے۔

حفیظ صاحب کی بیباکی سے بہتوں کی پیشانیاں شکن آلود ہو جاتی ہیں اور بہتوں کے نتھنے پھڑکنے لگتے ہیں لیکن ان کو اس کی پروا نہیں۔ انھوں نے تو اپنے قریبی دوستوں کے بارے میں بھی جب لکھا تو صرف مداحی نہیں کی بلکہ ان کی شخصیتوں کی کجی کو بھی اجاگر کیا۔ لیکن ان کی تنقید میں تنقیص کا پہلو نہیں ہوتا، ان کی مخالفت میں ذم کا شائبہ نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں ندائے ملت ٹرسٹ اور اخبار کے حوالے سے حضرت مولانا علی میاں ندوی کے ''منفی رویے'' کا ذکر بھی اپنے انداز میں کیا ہے۔ انھیں اس کا خوف نہیں رہا کہ علی میاں پر تنقید سے جانے کتنے لوگوں کی شکنوں پر بل پڑ جائیں گے۔ انھوں نے جو صحیح سمجھا وہ لکھا اور بلاخوف وتردد لکھا۔ جب وہ صحافت میں مکمل طور پر سرگرم تھے تب بھی بیباکی و بے خوفی کا مظاہرہ کرتے تھے اور آج بھی جبکہ وہ یومیہ ایک مضمون برائے اودھ نامہ لکھتے ہیں کسی کو بخشنے کو تیار نہیں ہوتے۔ (اس وقت وہ عمر کے 83/ویں سال میں ہیں اور روزانہ دو ایک مضامین لکھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی لکھنے پڑھنے کے دوسرے کام بھی کرتے ہیں)۔ اگر انھوں نے کبھی مصلحت سے کام لیا ہوتا اور اپنے قلم کی دھار کو ذرا سا کند کر دیا ہوتا تو وزارت وسفارت ان کے قدموں میں ہوتیں۔ مگر انھوں نے کبھی اس کی خواہش کی اور نہ ہی کبھی کسی مصلحت کوشی کو اپنی تحریر میں داخل ہونے دیا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ جب کسی بات کی مخالفت کرتے ہیں یا کسی کی رائے سے اختلاف کرتے ہیں تو تہذیب وشائستگی کے ساتھ کرتے ہیں۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ حفیظ نعمانی نے فلاں شخص کی کردار کشی کی ہے۔ انتہائی سخت بات بھی بے حد نرم لہجے میں

مگر پراثر انداز میں کہنے کا جو ہنر ان کے پاس ہے وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

سادہ اور سلیس جملے ان کی تحریر کی جان ہیں۔ غالب کے خطوط میں مکالمے کا مزا آتا ہے اور حفیظ نعمانی کی تحریر میں گفتگو کا لطف آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ مضمون نہیں لکھ رہے بلکہ بات چیت کر رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں ہی وہ ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ چونک جانا پڑتا ہے۔ ان کی تحریر حشو و زوائد سے پاک تو ہوتی ہی ہے غیر ضروری الفاظ بھی کہیں نہیں ملتے۔ وہ لفظوں کا استعمال بڑی چابکدستی سے کرتے ہیں۔ صرف ضروری الفاظ کو جگہ ملتی ہے۔ ایک بار پاکستان کے معروف کالم نگار عطاء الحق قاسمی نے کسی کی تحریر کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ فلاں صاحب لفظوں کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ چن چن کر استعمال کرتے ہیں۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ بندہ مر جائے تو مر جائے لفظ نہیں مرنا چاہیے۔ اس بات پر فوراً ہنسی تو آئے گی لیکن اس کی گہرائی میں جائیں تو پائیں گے کہ لفظوں کا صحیح استعمال کتنا بڑا فن ہے کہ بندہ مر جائے لفظ نہیں مرنا چاہیے۔ حفیظ نعمانی کی تحریر بھی ایسی ہی ہوتی ہے کہ اگر کسی جملے سے ایک لفظ نکال دیا جائے تو جملے کی عمارت ٹیڑھی ہو جائے۔ وہ کسی لفظ کو مرنے نہیں دیتے۔

ان کے اندر بڑی گہری سیاسی بصیرت ہے۔ کسی بھی سیاسی واقعہ کا تجزیہ وہ جس انداز میں کرتے ہیں وہ قارئین کو قائل کر دینے والا ہوتا ہے۔ سیاسی پیشین گوئیوں میں بھی ان کو مہارت حاصل ہے۔ خاص طور پر انتخابات کے سلسلے میں ان کی بیشتر پیشین گوئیاں حرف بحرف درست ثابت ہوتی ہیں۔ یہ کمال یوں ہی حاصل نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لیے تجربات و مشاہدات کی بھٹی میں خود کو تپانا پڑتا ہے تب کہیں جا کر سونا کندن بن پاتا ہے۔ حفیظ نعمانی نے خود کو تجربات کی بھٹی میں تپایا ہے۔ ملکی سیاست ہو یا بین الاقوامی، ہر معاملے پر ان کی نظر بڑی گہری ہے۔ وہ کسی بھی معاملے کے تمام پہلوؤں کا انتہائی غیر جانبداری کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں۔ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلہ ان کے قلم کی گرفت میں آنے کے بعد بہت سرل اور آسان ہو جاتا ہے۔ وہ جو بات کہتے ہیں دل فوراً بول پڑتا ہے کہ ارے ہاں یہ تو سامنے کی بات ہے۔ لیکن وہی سامنے کی بات اس وقت

تک نظر نہیں آتی جب تک کہ ان کا قلم قارئین کو نہیں دکھاتا۔ یہ خوبی بہت کم صحافیوں میں پائی جاتی ہے۔

حفیظ نعمانی نے عمر انصاری اور والی آسی وغیرہ کے ساتھ رہنے کے دوران کچھ عرصہ شاعری بھی کی لیکن بعد میں چھوڑ دی۔ اس کی وجہ ایک مضمون میں انھوں نے یہ بتائی ہے کہ ''جب شعر آرہا ہو اور گاہک آجائے تو برا لگتا ہے اور جب گاہک نہ ہو تو شعر بلانا پڑتا ہے''۔ جن دنوں کی یہ بات ہے وہ اپنے پرنٹنگ پریس تنویر پریس کا کام بھی دیکھتے تھے اور غالباً اس وقت تک انھوں نے صحافت میں قدم نہیں رکھا تھا۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انھوں نے شاعری ترک کر کے اچھا کیا۔ کیونکہ اگر وہ شاعری ہی کرتے رہتے تو ان کے گاہک دوسروں کے پاس چلے جاتے۔ لیکن اسی کے ساتھ شاید یہ بھی ہوا کہ اردو دنیا ایک اچھے شاعر سے محروم ہوگئی۔ کیونکہ ہمیں امید ہے کہ وہ شاعری بھی نثر کی طرح اعلیٰ پائے کی کرتے۔ اور یہ بھی ہوتا کہ ان کی بیاض کے صفحات پر قلمزد اشعار کے گل بوٹے نظر آتے۔ کیونکہ وہ جس طرح اپنے مضامین کو ''یہ کچھ بھی نہیں'' کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں اسی طرح بہت سے اشعار کو غیر معیاری قرار دے کر خارج کر دیتے۔

حفیظ نعمانی صاحب محبت کرنے والے انسان ہیں۔ ان کے سینے میں جو دل ہے وہ بہت بڑا ہے اور اس دل میں محبت کا بھنڈار ہے جو وہ سب پر لٹاتے رہتے ہیں۔ ''بجھے دیوں کی قطار'' میں جن شخصیات پر ان کے مضامین ہیں ان سے ان کی دوستی اور قربت اور والہانہ لگاؤ کا جو اندازہ ہوتا ہے اسی قسم کا لگاؤ میں اپنے ساتھ بھی پاتا ہوں۔ جبکہ میرے اور ان کے درمیان صرف تعارف ہے تعلق نہیں۔ تعلق جس چیز کا نام ہے وہ دو چار بار کی گفتگو یا ایک دو بار کی ملاقات کے بطن سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے برسوں کی شناسائی اور گہری رفاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔

بہت جی خوش ہوا حالی سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

جنوری 2015

پروفیسر اشتیاق دانش

جب 17 اپریل 2021 کی صبح کو یہ خبر ملی کہ پروفیسر اشتیاق دانش کل رات یعنی سولہ اور سترہ اپریل کی درمیانی شب میں انتقال کر گئے تو دل و دماغ کو شدید دھچکہ لگا۔ اس کا احساس ہی نہیں تھا کہ وہ بھی اس قافلے میں شامل ہونے جا رہے ہیں جو دنیا سے جاتا تو ہے مگر واپس نہیں آتا۔ ابھی کچھ دنوں قبل ہی تو ان سے بات ہوئی تھی۔ انھوں نے بتایا تھا کہ ان کی طبیعت ذرا ناساز ہے۔ استفسار پر انھوں نے نزلہ زکام کی شکایت کی تھی۔ لیکن اس کے بعد پھر بات نہیں ہو سکی۔ نہ ہی یہ معلوم ہو سکا کہ وہ اسپتال میں داخل ہیں۔ اسی لیے جب ان کے انتقال کی خبر سنی تو یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس سے قبل بھی یعنی کرونا کی پہلی لہر کے دوران بھی ان کو کچھ اسی قسم کی شکایت ہوئی تھی اور وہ روبصحت ہو گئے تھے۔ اس وقت جب ملک میں لاک ڈاون تھا تو اکثر گفتگو ہوتی رہی اور وہ مجھ کو یہی مشورہ دیتے رہے کہ گھر میں رہیے گا۔ باہر مت نکلیے گا۔ لیکن ایک بار یہ بھی کہا کہ کوئی بات نہیں میں آپ کے گھر آؤں گا۔ میں نے پوچھا کہ کیا پولیس والے باہر نکلنے کی اجازت دے رہے ہیں تو انھوں نے کہا کہ ہاں! لوگ آ جا تو رہے ہیں۔ کوئی ایسی خاص پابندی نہیں ہے۔ دراصل وہ یہ چاہتے تھے کہ ان کے غیر مطبوعہ کلام پر میں ایک نظر ڈال لوں۔ (اس کا ذکر ذرا بعد میں آئے گا۔) بہر حال ان کا یوں اٹھ جانا علمی و ادبی دنیا کا زبردست خسارہ ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ایک ماہ سے کرونا سے متاثر تھے اور مجیدیہ اسپتال جامعہ ہمدرد میں زیرِ علاج تھے۔

اعظم گڑھ سے تعلق رکھنے والے اشتیاق دانش نے جامعۃ الفلاح سے فراغت کے بعد 1990 میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے انگریزی میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ انھوں نے ویسٹ ایشین اسٹڈیز میں (یعنی مغربی ایشیاء مطالعات پر بھی) پی ایچ ڈی کی تھی۔ انھوں نے لندن سے بھی تعلیم حاصل کی تھی۔ بعد میں وہ مسلم یونیورسٹی میں اسلامک اسٹڈیز کے شعبے میں اسسٹنٹ پروفیسر ہو گئے۔ لیکن چونکہ وہاں ان کی ملازمت مستقل نہیں تھی اس لیے 1994 میں اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے جامعہ ہمدرد آ گئے۔ لیکن کئی برس قبل اُس وقت کے وائس چانسلر کے ساتھ اختلافات کی وجہ سے انھوں نے یونیورسٹی چھوڑ دی اور مقدمہ بازی میں الجھ گئے تھے۔ بہر حال مقدمہ ختم ہو گیا تھا اور توقع تھی کہ وہ جلد ہی ایک بار پھر اپنے عہدے پر بحال ہو جائیں گے۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ لہٰذا اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اسی درمیان وہ دہلی کے ایک تھنک ٹینک ڈاکٹر محمد منظور عالم کے ادارے ''انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز'' سے وابستہ ہو گئے۔ وہ اس کے فائنانس یعنی مالیاتی سکریٹری تھے اور دیگر ذمہ داریاں بھی سرانجام دیتے تھے۔

ان سے میری پہلی ملاقات 1995 میں ہوئی تھی۔ 1994 کے اواخر میں ان کے ایک دوست جناب راشد شاذ نے ''ملی ٹائمز'' نامی ایک اردو ہفت روزہ شروع کیا تھا جس کا دفتر ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر نئی دہلی میں بنایا گیا تھا۔ میں ایک طرح سے اس کا ایڈیٹر انچارج تھا۔ وہیں اسی عمارت میں راشد شاذ اور ان کے بعض عزیزوں کا قیام بھی تھا۔ جن میں ان کے چھوٹے بھائی مرشد کمال اور شکیل اختر بھی تھے۔ شکیل اختر ان کے چچازاد بھائی تھے اور ان سے بڑے تھے۔ وہ اخبار کی کمپوزنگ کرتے تھے۔ مرشد کمال جامعہ ملیہ اسلامیہ میں زیر تعلیم تھے۔ انھوں نے جامعہ کی طلبہ یونین کا الیکشن لڑا تھا اور نائب صدر کے منصب پر منتخب ہوئے تھے۔ اس وقت وہ خلیج میں برسرکار ہیں۔ وہیں ان کے بڑے بھائی نجیب اختر سے بھی ملاقات ہوئی اور دوسرے چچازاد بھائی جمیل اختر سے بھی۔ نجیب اختر و جمیل اختر نے جے این یو سے پی ایچ ڈی کی ہے۔ اشتیاق دانش بھی ان لوگوں کے ساتھ اسی عمارت میں مقیم تھے اور وہیں سے جامعہ ہمدرد آیا جایا کرتے تھے۔

ان دونوں کے ایک اور مشترک دوست مجتبیٰ بھائی بھی وہیں قیام پذیر تھے۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی سے جیالوجی میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ ایک طرح سے وہ ادارہ ملی ٹائمز کے منتظم اعلیٰ تھے۔ وہ ہمارے ہم وطن تھے۔ ہم وطن سے مراد ہم علاقہ بھی کہہ لیجیے۔ اتر پردیش کے بلرامپور ضلع کی مشہور آبادی تلشی پور ان کا وطن ہے۔ میں سنت کبیر نگر ضلع کا باشندہ۔ لہٰذا دونوں میں قربت ہو گئی۔ مجتبیٰ بھائی میرے علاوہ دفتر کے دیگر کارکنوں کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ جن میں اخبار کے خطاط عبد الکریم اور سرکولیشن منیجر رانا صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ بعد میں اخبار کی سیٹنگ جناب ذکیر الدین صاحب نے بھی کی تھی۔ ابتدائی ایام میں ہمارے عزیز مولانا تجمل حسین ندوی بھی کارکنوں میں شامل تھے۔ بعد میں قطر سفارت خانے میں انھیں ملازمت مل گئی اور وہ وہاں چلے گئے۔ وہیں ایک انتہائی شریف النفس شخص جناب محمد عامر سے بھی ملاقات ہوئی جو کہ ملی ٹائمز کا اکاؤنٹ دیکھتے تھے۔ ان سے آج تک میرے ویسے ہی مراسم ہیں۔ میں انھیں کے توسط سے اپنا انکم ٹیکس ریٹرن داخل کرتا ہوں۔

مجتبیٰ بھائی انتہائی دلچسپ، بذلہ سنج، حاضر جواب اور فقرے باز ہیں۔ ایک علیگیرین میں جو جو خوبیاں ہونی چاہئیں سب ان میں موجود ہیں۔ ہم لوگ اور راشد شاذ بھی ان کے پر لطف جملوں سے خوب محظوظ ہوتے۔ میں نے ان تینوں (راشد شاذ، اشتیاق دانش، مجتبیٰ بھائی) کی زبانی پہلی بار اور بار بار پروفیسر فیضان مصطفیٰ کا ذکر سنا۔ وہ لوگ اکثر ان کے حوالے سے کوئی نہ کوئی بات کرتے رہتے۔ جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ لوگ بہت گہرے اور مشترک دوست ہیں۔ اس وقت فیضان صاحب مسلم یونیورسٹی ہی میں تھے۔ بعد میں وہ نلسار لاء یونیورسٹی حیدرآباد کے وائس چانسلر کے منصب پر فائز ہوئے۔ ایک بار مجھے کسی ایشو پر ان سے انٹرویو کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اشتیاق صاحب ہی نے مجھے ان کا موبائل نمبر دیا تھا۔ بہر حال مجتبیٰ بھائی مجھ پر بطور خاص مہربان رہتے۔ وہ اکثر کہتے کہ میں نے آپ کو اس لیے اس اخبار کا ایڈیٹر انچارج بنوایا ہے تاکہ آپ کے اندر خود اعتمادی پیدا ہو جائے اور آپ دوسری جگہ جب جائیں تو ناکام نہ ہوں۔

اور یہ بات درست ہے کہ اس اخبار میں کام کرنے کی وجہ سے میرے اندر خود اعتمادی آگئی تھی۔ جناب راشد شاذ عام ڈگر سے ہٹ کر چلنے والے انسان ہیں۔ وہ ایک انتہائی باصلاحیت اور ذہین شخص ہیں۔ وہ معیار سے سمجھوتہ نہیں کرتے اور کوشش کرتے کہ ملی ٹائمز دیگر اردو ہفت روزہ اخباروں میں منفرد مقام پیدا کرے اور وہ اس میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ اخبار پر ان کی فکر کی چھاپ تھی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد اخبار بند ہو گیا۔ اگر وہ نکلتا رہتا تو ممکن ہے کہ اُردو صحافت میں ایک مقام پیدا کرتا۔ بعد میں وہ مسلم یونیورسٹی میں استاد ہو گئے۔ انھوں نے وہاں برج کورس کا آغاز کیا جس کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ اس کورس کے پہلے ڈائرکٹر تھے۔ بہر حال میں ذکر کر رہا تھا مجتبیٰ بھائی کا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ سعودی عرب چلے گئے۔ وہاں وہ کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ریاض میں سائنس داں کے منصب پر فائز رہے۔ کئی برس کی ملازمت کے بعد وہ مستقل طور پر ہندوستان واپس آچکے ہیں۔ اب انھوں نے لکھنؤ کو اپنا وطن ثانی بنا لیا ہے۔ وہ اب بھی ملی ٹائمز کے دنوں اور کارکنوں کو یاد کرتے اور اس بارے میں تادیر گفتگو کرتے ہیں۔

جناب راشد شاذ نے اشتیاق دانش کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور اس کا واحد طریقہ یہ تھا کہ ان سے اخبار کے لیے مضامین لکھوائے جائیں۔ وہ مغربی ایشیا کے موضوع پر مضمون لکھا کرتے تھے۔ اکثر و بیشتر ان کے مضمون کا انتظار کرنا پڑتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب کئی تقاضے ہو جاتے تو وہ صبح کے وقت جامعہ ہمدرد جانے کے لیے جب اپنے کمرے سے نکلتے تو عجلت میں مضمون تھماتے ہوئے چلے جاتے۔ ان کے مضامین اتنے معلوماتی اور جامع ہوتے کہ اگر اخبار کے صفحے کی ضرورت کے پیش نظر کسی مضمون کو ایڈیٹ کرنا پڑتا تو سخت محنت کرنی پڑتی۔ انھوں نے کافی دنوں تک اخبار کے لیے مضمون نویسی کی۔ کچھ دنوں کے بعد انھوں نے اپنی رہائش کا کہیں اور انتظام کر لیا اور پھر اسی دوران ان کی شادی ہو گئی۔

ہم لوگوں نے بھی اس شادی میں شرکت کی تھی۔ اس سلسلے میں سب کو شام کے

وقت بٹلہ ہاؤس چوک پر اکٹھا ہونا تھا۔ میں بھی وقت مقررہ پر وہاں پہنچا تو میں نے دور سے پروفیسر نثار احمد فاروقی کو آتے دیکھا۔ میں نے لپک کر ان کو سلام کیا۔ لیکن ہاتھ ملاتے وقت محسوس ہوا کہ وہ تو کوئی اور صاحب ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا نام شیث محمد اسمٰعیل اعظمی ہے۔ وہ نائجیریا میں ایک عرصے تک استاد تھے۔ اب ہندوستان واپس آگئے ہیں اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اسلامک اسٹڈیز میں پروفیسر ہیں۔ بعد میں انھوں نے مجھے بتایا کہ اکثر لوگ ان کے چہرے مہرے کی وجہ سے انھیں پروفیسر نثار احمد فاروقی سمجھ بیٹھتے ہیں۔ دونوں کے چہروں میں کسی حد تک مماثلت تھی۔ اس وقت میں ذاکرنگر ویسٹ میں رہ رہا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ذاکرنگر ویسٹ جاتے ہوئے شروع ہی میں ہائی ٹینشن پول کے پاس شیث صاحب کا دولت کدہ ہے۔ وہاں میری آمد و رفت شروع ہوگئی۔ وہ پروفیسر شعیب اعظمی کے چھوٹے بھائی اور بعد میں ہمارے دوست ہو جانے والے انور یوسف مرحوم (قلمی نام اے وائی اعظمی، سب ایڈیٹر قومی آواز) کے چچا تھے۔ شیث صاحب جب شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ کے صدر ہوئے تو انھوں نے مجھے ایک لیکچر کے لیے مدعو کیا۔ عنوان تھا ''ہندوستانی میڈیا اور ہمارا معاشرہ''۔ لیکن وقت بہت کم تھا۔ یہی کوئی تین چار روز۔ میں نے سخت محنت کی اور ایک بہت اچھا مقالہ تیار کیا جسے پڑھنے میں 45 منٹ لگے تھے۔ اس مجلس میں اساتذہ اور طلبہ کے ساتھ ساتھ شعبے کے سابق صدر پروفیسر اختر الواسع بھی تھے۔ انھوں نے میرے مقالے کی خاصی تعریف کی تھی۔ وہ مقالہ میری کتاب ''میڈیا روپ اور بہروپ'' کی تصنیف کی بنیاد بنا تھا۔

بہر حال بعد میں ملی ٹائمز بند ہوگیا۔ اس کا اسٹاف اِدھر اُدھر ہوگیا۔ مجتبیٰ بھائی سعودی عرب جا چکے تھے۔ جناب راشد شاذ علیگڑھ منتقل ہو گئے۔ حالانکہ ابوالفضل انکلیو میں جماعت اسلامی ہند کے کیمپس سے متصل ان کا مکان بن کر تیار ہوگیا تھا۔ بعد میں اس کے برابر میں الشفا ہاسپٹل قائم ہوا۔ لیکن ملی ٹائمز کے بند ہونے کے بعد بھی اشتیاق دانش سے میرا رابطہ قائم رہا۔ بلکہ جب وہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز سے وابستہ ہوئے تو کسی نہ کسی پروگرام میں ان سے ملاقات ہو جاتی اور مختلف موضوعات پر گفت و

شنید بھی ہوتی۔

سال 2015 میں اس وقت مجھے خوشگوار حیرت ہوئی جب انھوں نے اپنا شعری مجموعہ ''شور خاموشی'' عنایت کیا اور فرمائش کی کہ میں اس پر تبصرہ لکھوں۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ شاعر بھی ہیں۔ ان کی شخصیت میں شعرا کی خصوصیات بھی نہیں تھیں۔ لیکن اس مجموعے سے معلوم ہوا کہ وہ 1984 یا اس کے پہلے سے ہی طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ میں نے اس مجموعے پر تبصرہ کیا جو کئی اخباروں میں شائع ہوا۔ میں نے بالکل غیر جانبداری کے ساتھ مجموعے کا جائزہ لیا۔ لہٰذا کچھ اشعار پر میں نے نقد بھی کی۔ لیکن انھوں نے اسے بخوشی قبول کیا اور نہ صرف یہ کہ اس مضمون کو بہت پسند کیا بلکہ اسے کئی جگہ استعمال بھی کیا۔ جی چاہتا ہے کہ اس تبصرے کے کچھ اقتباسات نقل کر دوں تا کہ ان کی شاعری کے بارے میں قارئین کو ہلکا سا اندازہ ہو جائے۔ میں نے لکھا تھا:

''پروفیسر اشتیاق دانش ایک سنجیدہ محقق ہیں۔ عالم اسلام بالخصوص خلیجی ملکوں کی سیاسی وسماجی صورت حال پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کو اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور عربی پر بھی عبور حاصل ہے۔ ان کے مضامین اردو اور انگریزی اخباروں میں مسلسل شائع ہوتے رہتے ہیں۔ علمی حلقوں میں وہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بھلا ہو سوشل میڈیا کا جس نے بہت سے پردہ داروں کو بھی بے پردہ کر دیا ہے۔ ایک روز اچانک فیس بک پر اشتیاق صاحب اپنی ایک غزل کے ساتھ نمودار ہوئے۔ چند روز کے بعد پھر ایک غزل سامنے آگئی۔ پھر تو دھیرے دھیرے غزلوں کی بھرمار ہوگئی۔ ایک روز یہ اطلاع بھی پڑھنے کو ملی کہ ان کا شعری مجموعہ ''شور خاموشی'' عنقریب شائع ہو کر منظر عام پر آنے والا ہے۔ بڑی حیرت ہوئی کہ آنجناب جو زاہد خشک نظر آتے ہیں شاعر نکلے۔ حالانکہ میں ان کو جتنا تھوڑا بہت جانتا ہوں اس میں وہ کہیں سے بھی شاعر نظر نہیں آتے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کے شعری مجموعے کا دیدار بھی ہو گیا۔ اشتیاق دانش روایتی شعرا سے الگ ہیں۔ ان کے اندر نہ تو شعر سنانے کی حرص ہے اور نہ ہی مزاج میں چھپاس کا شائبہ۔ وہ لوگوں کو بور کر کے ان سے داد کی بھیک مانگنے میں بھی یقین نہیں رکھتے۔ ہاں فیس بک پر وہ ضرور

اپنے کلام سے شائقین کو محظوظ کرتے رہتے ہیں۔ جب میں نے ان کے مجموعے پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ ان کی شاعری کے کئی رنگ ہیں۔ وہ غزلیں بھی کہتے ہیں اور نظمیں بھی۔ ان کی غزلوں میں بڑا تنوع ہے۔ افکار میں رنگا رنگی ہے۔ عشقیہ اشعار کی بھرمار ہے۔ کہیں کہیں عشق مجازی کے پردے میں عشق حقیقی سے روبرو کرانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں روایتی آہنگ بھی ہے اور جدید لب و لہجے کی آمیزش بھی۔ یہ شعر دیکھیے:

یہ کیا ہے جب بھی بدن پر ترے نظر جائے
حیا سے حسن ترا اور بھی نکھر جائے
تمھارے جسم کی خوشبو فضا میں چھائی ہے
کہ بزم وصل خیالوں نے بس سجائی ہے

کبھی کبھی وہ خود فراموشی میں بھی گرفتار ہو جاتے ہیں اور جب ایسا ہوتا ہے تو ایسے شعر کہتے ہیں:

خبر کسے ہے زمانے کے روز و شب کی یہاں
کبھی تو خود مجھے اپنا پتہ نہیں ملتا
سنائی دیتی ہے آہٹ کسی کے قدموں کی
کوئی قریب ہے پھر بھی کوئی قریب نہیں

ان کی شاعری میں اندرون ذات کا کرب بھی ہے اور زمانے کے بخشے ہوئے تلخ تجربات کی عکاسی بھی۔ کہیں کہیں زمانے کا گلہ بھی ہے۔ لیکن زیادہ تر حالات کو خاموشی کے ساتھ سہہ جانے کا حوصلہ بھی ہے۔ ان کے اندر جرأت اظہار بھی ہے اور اظہار کے مختلف پیرایے بھی ہیں۔ یہ شعر ملاحظہ کریں:

جو خار و خس تھے موج کے ہمراہ بہہ گئے
پانی مرے نصیب کے کھیتوں میں رہ گئے

الفاظ تھے کہ درد کا دریائے موجزن
منہ سے نکل نہ پائے تو آنکھوں سے بہہ گئے

لیکن یہاں منہ سے نکل نہ پائے نے مزا کرکرا کر دیا۔ اس کے بجائے زبان سے ادا نہ ہونے کی بات کہتے تو اثر انگیزی میں اضافہ ہوتا۔ انھوں نے ایسے بہت سے شعر بھی کہے ہیں جو بالکل اچھوتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شعر:

یہ بھی ہے کوئی شرط کہ مکہ تو جایئے
لیکن طوافِ خانۂ کعبہ نہ کیجیے
یہ قیس بن کے دشت میں آپ آگئے تو ہیں
لیکن تلاشِ منزلِ لیلیٰ نہ کیجیے

اچھا مشورہ دیا انھوں نے جناب قیس کو۔ لیکن اگر انھوں نے ''یہ قیس بن کے'' کی جگہ پر ''پھر قیس بن کے'' لکھتے یا ''یوں قیس بن کے'' لکھتے تو شائد زیادہ لطف آتا۔ ان کی بہت سی غزلوں میں جہاں آمد ہی آمد ہے وہیں بے شمار غزلوں کا لطف آورد نے ختم کر دیا ہے۔ کچھ اشعار تو ڈھلے ڈھلائے نکل آئے ہیں لیکن بہت سے شعروں کو انھیں ردیف و قوافی میں ڈھالنا پڑا ہے۔ اس کے علاوہ ایسا لگتا ہے جیسے اشتیاق دانش نے شاعری میں کچھ تجربے بھی کیے ہیں۔ انھوں نے ردیف و قافیہ کے بندھے ٹکے راستے سے گزرنے کے بجائے اپنی الگ راہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ حالانکہ ہم جیسے کند ذہن لوگ جو شاعری کر کے چھوڑ چکے ہیں اس مصلحت کی تہہ تک نہیں پہنچ سکے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا۔ اس بارے میں وہی اپنی رائے ظاہر کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک غزل کا مطلع ہے:

وہ سدا آس پاس رہتا ہے
پھر بھی یہ دل اداس رہتا ہے

پہلی بات تو اس میں ایک فلمی نغمے کی دھن محسوس ہوتی ہے اور دوسری بات یہ کہ بعد کے اشعار میں انھوں نے التماس کرتا ہے، پاس کرتا ہے پھر آگے جا کر پیاس رکھتا

ہے اساس رکھتا ہے باندھا ہے۔
اس مجموعے میں کچھ نظمیں بھی ہیں جو اتنی کم مقدار میں ہیں کہ تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ لیکن سچ بات یہ ہے کہ مجھے ان کی غزلوں سے زیادہ ان کی نظموں نے متاثر کیا۔ خاص طور پر آزاد نظموں نے۔ ان آزاد نظموں میں شور خاموشی، **خدا تجھے میں نے پالیا ہے** اور پھول بہت اچھی ہیں۔ ان کی پابند نظمیں وہ مزا نہیں دیتیں جو آزاد نظمیں دیتی ہیں۔ اس لیے ان سے میری گزارش ہے کہ وہ آزاد نظموں پر زیادہ طبع آزمائی کریں۔ ممکن ہو تو اگلا مجموعہ نظموں کا شائع کریں تاکہ ان کی شاعری کا ایک اور رنگ اور بہتر رنگ لوگ دیکھ سکیں اور لطف اندوز ہو سکیں"۔

شاید میرے اس تبصرے سے انھوں نے مجھے کوئی بہت بڑا سخن فہم سمجھ لیا۔ اس لیے ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے غیر مطبوعہ کلام پر ایک نظر ڈال لوں۔ کرونا کی پہلی لہر کے دوران گزشتہ سال غریب خانے پر آکر تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل اپنا غیر مطبوعہ کلام وہ مجھے دے گئے تھے۔ اس وقت وہ مختلف موضوعات پر تقریباً ایک گھنٹہ گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے جامعہ ہمدرد کے ساتھ ہونے والی مقدمہ بازی کی بھی تفصیلات بتائیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے کلاسیکی شعرا پر بھی خاصی گفتگو کی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے کلاسیکی اور متقدمین شعرا کے کلام کا بھی خاصا مطالعہ کیا ہے۔ بہر حال میں نے پورے غیر مطبوعہ مجموعے پر نظر ڈالی اور جہاں ضرورت پڑی مشورے بھی دیے جو انھوں نے بخوشی قبول کر لیے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں کئی مہینے لگ گئے۔ لاک ڈاون اور دیگر بعض اسباب سے وہ مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ میں نے ایک بار استفسار کیا تو انھوں نے کہا کہ کرونا کے حالات ذرا بہتر ہو جائیں تو میں اس کو شائع کرواتا ہوں۔
سال 2017 میں میں نے اہلیہ کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کی تھی۔ واپسی پر میں نے اس کی روداد لکھی جو کئی اخباروں میں قسطوار شائع ہوئی۔ جب روداد کی قسطیں مکمل ہو گئیں تو کئی افراد نے تقاضہ کیا کہ اور لکھیے ابھی کیوں ختم کر دیا۔ ان میں دو بہت ہی محترم شخصیات بھی شامل تھیں۔ ایک سینئر اور بزرگ صحافی اور ہمارے کرم فرما جناب عالم نقوی

اور دوسرے پروفیسر اشتیاق دانش۔ ہم نے ان دونوں حضرات سے عرض کیا کہ یہ سفر تو بارہ تیرہ دنوں پر مشتمل تھا اور اب تاثرات ختم ہو گئے، اب کیا لکھیں۔ دونوں نے یہ مشورہ دیا کہ اس میں کچھ اور تفصیلات ڈال کر کم از کم سو صفحات کی کتاب شائع کر دیجیے۔

پروفیسر اشتیاق دانش نے ایک بہت اچھا مشورہ یہ دیا کہ جذبات و کیفیات اور وارداتِ قلبی کا بیان تو سبھی کرتے ہیں، آپ نے بھی کیا ہے، لیکن آپ اس میں ایک اور پہلو جوڑ سکتے ہیں۔ وہ پہلو ہے حج و عمرہ سے سعودی عرب کو ہونے والی آمدنی اور اس آمدنی سے سعودی معیشت پر پڑنے والے اثرات کا۔ اس کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیے۔ ہم نے کہا کہ ہاں موضوع تو بہت اچھا ہے۔ اس پر لکھا بھی جانا چاہیے۔ کیونکہ حج و عمرہ عبادت تو ہے ہی، یہ ایک قسم کی مذہبی سیاحت بھی ہے۔ حج و عمرہ سے ظاہر ہے سعودی عرب کو بہت زیادہ مالی فائدہ ہوتا ہے اور اس کے اچھے اثرات وہاں کی معیشت پر پڑتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے اس سلسلے میں تفصیلات جمع کرنے کی کوشش کی لیکن کہیں سے کچھ بھی مواد ملنا مشکل تھا۔ لیکن بہر حال کسی طرح کچھ حاصل کیا اور ایک مختصر سا مضمون لکھ دیا۔ جسے اس روداد میں شامل کر دیا گیا۔ اس میں اختصار کے ساتھ اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے کہ حج و عمرہ سے سعودی عرب کو کتنا فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ مکمل تفصیل میرے دوسرے سفرنامۂ حج "باز دید حرم" میں شامل ہے۔ (میرا پہلا سفرنامۂ حج "پھر سوئے حرم لے چل" 2006 میں شائع ہوا تھا)۔ وہ اخباروں میں شائع ہونے والے میرے مضامین پر بھی بعض اوقات فون کر کے تبصرہ کرتے۔

پرفیسر اشتیاق دانش سے میرا ایک اور تعلق تھا۔ مجھے ریڈیو وائس آف امریکہ کے لیے رپورٹنگ کے سلسلے میں مختلف موضوعات پر ماہرین کے ایکسپرٹ کمنٹس بھی لینے پڑتے ہیں۔ جب بھی مجھے مغربی ایشیا سے متعلق کسی رپورٹ پر کمنٹ کی ضرورت پڑتی تو میں ان کو فون کرتا اور وہ اس موضوع پر برجستہ تبصرہ کرتے اور اتنی معلومات بہم پہنچا دیتے کہ جو رپورٹ کے لیے کافی سے بھی زیادہ ہوتی۔ اس دوران ان سے ایک طرح سے قربت بھی ہو گئی تھی۔ لیکن ان کے بارہا اصرار کے باوجود میں ابوالفضل میں واقع ان کے

دولت خانے پر کبھی حاضری نہیں دے سکا۔ جب بھی انھوں نے بلایا تو میں نے اپنی مصروفیت کی وجہ سے یہی کہا کہ میں ضرور آؤں گا اور آپ کے ہمسائے ڈاکٹر شفقت اعظمی سے بھی ملاقات کروں گا۔ لیکن وہ دن نہیں آیا۔ ان کا اس طرح اچانک چلے جانا میرا ذاتی خسارہ بھی ہے۔

پروفیسر اشتیاق دانش ماہر اسلامیات تو تھے ہی مشرق وسطیٰ پر ان کی بڑی گہری نظر تھی۔ جزیات پر بھی وہ کافی دیر تک بولنے اور لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ خلیجی ممالک کی سیاست، معیشت و معاشرت ان کا خاص موضوع تھا۔ وہ ایک مصنف بھی تھے۔ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں ان کی تصنیفات شائع ہوئیں اور مقبول عام ہوئی ہیں۔ وہ انگریزی میں بھی شاعری کرتے تھے۔ پروفیسر فیضان مصطفیٰ کے مطابق انھوں نے بہت دلچسپ موضوعات پر کام کیا جیسے کہ اسلام اینڈ گلوبلائزیشن، اسلام اینڈ ملٹی کلچرلزم، اسلام اینڈ پروموشن آف نالج، اسلامی و عالمی قوانین میں انسانی حقوق اور اسلام اور جدیدیت۔ ابھی حال ہی میں انگریزی میں ان کی ایک کتاب ڈاکٹر حمید اللہ پر آئی ہے جس کا نام ہے ''دی لیگیسی آف محمد حمید اللہ''۔ ان کی نصف درجن سے زائد انگریزی کتابیں شائع ہوئی ہیں جو امیزون پر موجود ہیں۔ بہر حال پروفیسر اشتیاق دانش نہ صرف یہ کہ ایک ماہر اسلامیات اور مغربی ایشیا کے امور کے ماہر تھے بلکہ ایک بہت اچھے انسان بھی تھے۔ بظاہر ان کی شخصیت میں بڑا کھردرا پن تھا لیکن اندر سے وہ اتنے ہی نرم ملائم اور بااخلاق تھے۔ ان کی یاد ہمیشہ آتی رہے گی۔

مئی 2021

○○

ڈاکٹر حنیف ترین

سال 2020 گزشتہ برسوں کے مقابلے میں بالکل مختلف تھا۔ اس نے زندگی کے تمام شعبوں کو بری طرح متاثر کیا۔ علم وادب کا شعبہ بھی اس کے دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ اس ایک سال نے جانے کتنی قد آور شخصیات کو ہم سے چھین لیا۔ بڑے بڑے نامی گرامی ادباء وشعراء دنیا سے کوچ کر گئے۔ جانے والوں میں ایک درجن سے زائد ایسی شخصیات بھی شامل ہیں جن سے راقم الحروف کی شناسائی تھی۔ بلکہ ان میں سے کئی کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے۔ ان شخصیات کے جانے کا غم اتنا بڑا ہے کہ اس کے ازالے کی فی الحال کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ انہی شخصیات میں معروف شاعر ڈاکٹر حنیف ترین بھی شامل ہیں۔ یہ تو معلوم تھا کہ وہ بیمار چل رہے ہیں لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلد ہم لوگوں سے جدا ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ان کے انتقال کی خبر ملی تو دل ودماغ کو شدید دھچکہ لگا۔ ذہن یہ تسلیم کرنے کو تیار ہی نہیں تھا کہ حنیف ترین جیسا ہنگامہ خیز شخص اتنی خاموشی سے دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ ان کے انتقال کا میرے اوپر بڑا اثر رہا اور کئی دنوں تک میں اس غم سے باہر نہیں نکل پایا۔ جب غم والم کا بوجھ کچھ کم ہوا تو ان کی یادیں سامنے آکر کھڑی ہو گئیں۔ پھر تو یکے بعد دیگرے بہت سی باتیں یاد آنے لگیں۔

ڈاکٹر حنیف ترین سے میری پہلی ملاقات 1988 میں سابق رکن پارلیمنٹ و سابق سفیر ہند جناب م۔ افضل صاحب کے ہفت روزہ ''اخبار نو'' کے دفتر واقع ترکمان گیٹ نئی دہلی میں ہوئی تھی۔ اس وقت میں اس کے ایڈیٹوریل میں شامل تھا۔ وہ افضل

صاحب کے دوست تھے۔ وہ دفتر میں کیا آئے کہ ایسا لگا جیسے زلزلہ آ گیا ہو۔ کوئی طوفان ہو جو انسانی روپ دھارن کر کے آفس میں گھس آیا ہو۔ اخبار نو کا دفتر انتہائی چھوٹا جسے افضل صاحب بعض اوقات کبوتر خانہ بھی کہا کرتے تھے، ان کی پرشور آواز اور فلک شگاف قہقہوں سے بھر گیا۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ ڈاکٹر حنیف ترین ہیں، سعودی عرب میں رہتے ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں۔ لیکن طوفان بردوش ہیں۔ بسیار گو ہیں۔ البتہ ہر شخص کو اپنا دوست بنانے کے فن میں ماہر ہیں۔ انھوں نے دفتر سے نکلتے وقت مجھ سے بھی ملاقات کی اور کہا کہ ''ڈیئر تم سے ملاقات ہوتی رہے گی''۔ اور واقعی ملاقات ہونے لگی۔ وہ اپنی تخلیقات اس ہدایت کے ساتھ میرے پاس بھیجنے لگے کہ انھیں کہیں چھپواؤ۔ کبھی سعودی عرب کے عرعر میں ہونے والی شعری نشست کی رپورٹ بھیجتے اور کبھی کچھ اور۔ عرعر سعودی عرب کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہ اس کے ہیلتھ سینٹر میں ڈاکٹر تھے۔ انھوں نے عرعر کو ہندو پاک میں متعارف کرا دیا۔

کچھ دنوں کے بعد دہلی آئے تو پھر ملاقات ہوئی۔ لیکن یہ ملاقات بڑی عجیب و غریب تھی۔ دیکھتے ہی سختی سے چمٹ گئے اور رخسار پر بوسے پر بوسہ دینے لگے۔ بہت عجیب لگا کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔ میں خاموش رہا اور برداشت کرتا رہا۔ پھر تو یہ معمول بن گیا۔ ان کے ساتھ کچھ جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا تو دیکھا کہ جو بھی مل رہا ہے اس کے ساتھ ان کا وہی ہنگامہ خیز دوستانہ سلوک ہے۔ وہی پکڑ دھکڑ اور وہی چمٹ جانا اور گال پر بوسے دینا۔ کسی سے میں نے پوچھا کہ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہ عربوں کا کلچر ہے۔ کسی شناسا سے ملتے ہیں تو اظہار محبت و الفت کے لیے رخسار پر بوسہ دیتے ہیں۔ اس سے گھبرانا نہیں۔ اس میں کسی بری نیت کا دخل نہیں ہے۔ خیر میں ان کی اس عادت کا عادی ہو گیا۔ حنیف ترین سعودی عرب سے اکثر فون کیا کرتے اور طویل ترین گفتگو کرتے۔ کہتے کہ میری جان میں انڈیا آرہا ہوں۔ فلاں فلاں کام کرنا ہے۔ فلاں فلاں سے ملنا ہے۔ تم سے مجھے بہت کچھ مدد ملے گی۔ تم سے میں بہت کام لوں گا۔ ''میری جان'' ان کا ایک طرح سے تکیہ کلام تھا۔ جب بھی وہ انڈیا آتے تو ان کے حلقۂ احباب

میں دو چار دس کا اضافہ ہو جاتا۔ گفتگو میں اکثر و بیشتر بڑے مسلم پولیس افسروں اور شاعروں وادیبوں کے نام لیتے اور کہتے کہ ان کے پاس جانا ہے یا ان سے مل کر آرہا ہوں۔ ان لوگوں سے ان کی واقعی شناسائی تھی۔ بلکہ بعض سے دوستانہ بھی تھا۔ جب ان کے چچازاد بھائی جناب ندیم ترین نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایک ہاسٹل کی تعمیر کروائی تو بڑے فخر سے کہتے کہ دیکھو میرے بھائی نے کتنا بڑا کام کیا ہے۔ وہ سنبھل کے محلہ سرائے ترین کے رہنے والے تھے۔ اس لحاظ سے وہ اپنے نام کے ساتھ ترین لگایا کرتے تھے۔ جس طرح ڈاکٹر حنیف ترین نے سعودی عرب کے چھوٹے سے قصبے عرعر کو ہند و پاک میں مشہور کر دیا اسی طرح انھوں نے ترین کو بھی شہرت دے دی۔ انھوں نے اور ان کی اہلیہ نے بھی، جو کہ کشمیر سے تعلق رکھتی ہیں، مسلم یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ بھی ایم بی بی ایس تھے اوران کی اہلیہ بھی ایم بی بی ایس ہیں۔ ایک بیٹا اور بیٹی بھی ایم بی بی ایس ہیں۔ جبکہ ایک بیٹا انجینئر ہے۔

اسی درمیان انھوں نے جامعہ نگر کے علاقے جوگابائی میں واقع پرساد کمپلیکس میں ایک فلیٹ لے لیا تھا۔ پھر کیا تھا۔ میں ذاکر نگر میں وہ جوگا بائی میں۔ جب چاہا فون گھما دیا اور اپنے پاس بلالیا۔ یوں تو ان کا حلقہ بہت بڑا تھا۔ لیکن جو قریبی حلقہ تھا اس میں خاکسار کے علاوہ حقانی القاسمی بھی تھے۔ میں تو بعض اوقات ڈاکٹر صاحب کا مذاق بھی اڑا دیا کرتا تھا لیکن حقانی صاحب ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اسی درمیان مجھے ایک معاملے میں کچھ پیسوں کی ضرورت پڑی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان کے سامنے اپنا مسئلہ رکھا۔ انھوں نے پوچھا کتنا چاہیے۔ میں نے کہا اتنا چاہیے۔ انھوں نے فوراً اتنی رقم کا ایک چیک بھیج دیا۔ ان دنوں میری مالی پوزیشن بہت کمزور تھی۔ جب میں کافی دنوں کے بعد قرض ادا کرنے کی پوزیشن میں آیا اور میں نے ان سے کہا کہ آپ وہ لے لیجیے۔ کیا لے لیجیے۔ جو آپ نے دیا تھا۔ بہت سختی سے ڈانٹا اور کہا کہ تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔ میں نے لینے کے لیے تھوڑی دیا تھا۔ پھر ایسی بات کبھی مت کرنا۔ اسی درمیان انھوں نے مجھے ایک فیکس مشین دی اور کہا کہ اسے اپنے گھر پر لگالو۔ شاید کبھی کام آئے۔ لیکن اس کی کبھی

ضرورت نہیں پڑی اور کچھ دنوں کے بعد میں نے وہ مشین ان کو واپس کر دی۔ میرے کسی کام کی نہیں تھی۔

اس درمیان ان کے جو بھی شعری مجموعے آتے وہ میرے پاس بھیجتے اور میں کوشش کرتا کہ ان پر تبصرہ لکھوں اور کہیں چھپوا دوں۔ ایک بار جب وہ ہندوستان آئے تو مجھ سے کہا کہ فلاں تاریخ کو ساہتیہ اکیڈمی میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی صدارت میں میری کتاب کا اجرا ہے۔ تمھیں تو اس میں چلنا ہی ہے، میرے اوپر ایک مضمون بھی پڑھنا ہے۔ میں نے ہامی بھر لی۔ میں نے ایک خاکہ نما مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''طوفان بردوش ڈاکٹر حنیف ترین''۔ میں نے اس تقریب میں اسے پیش کیا۔ لوگ بہت محظوظ ہوئے۔ بعد میں وہ مضمون کہیں چھپا بھی تھا۔ تقریب کے بعد ان کی اہلیہ ڈاکٹر شمیم اختر صاحبہ نے جن کا میں بہت احترام کرتا ہوں، اس خاکے کی بہت تعریف کی۔ تعریف تو حنیف ترین نے بھی کی۔ لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ ''ارے یار تم تو بڑے خطرناک آدمی ہو''۔ ان کا یہ جملہ آج تک مجھے یاد ہے۔ اس مضمون میں ان کی شاعری کے بجائے ان کی شخصیت پر میں نے روشنی ڈالی تھی اور ان کی ہنگامہ خیزی کو موضوع بنایا تھا۔ اشاروں اشاروں میں ان کی بسیار گوئی (نظم ونثر دونوں) پر میں نے طنز بھی کیا تھا۔ وہ مضمون تو کہیں کھو گیا لیکن اس کا ایک جملہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ ''ایک شریف ترین شخص نے مجھ سے کہا کہ اگر حنیف ترین اپنے مزاج میں خفیف ترین سا بدلاؤ لے آئیں تو ذہین ترین ہو جائیں گے۔ میں نے کہا کہ جس دن انھوں نے اس مشورے پر عمل کیا وہ سب کچھ رہیں گے مگر حنیف ترین نہیں رہیں گے''۔ لوگوں نے اس کا خوب لطف لیا تھا۔

اسی دوران انھوں نے مجھ سے کہا کہ تمھیں ماہنامہ کتاب نما کا وہ خصوصی شمارہ ایڈٹ کرنا ہے جو میرے اوپر شائع ہونے والا ہے۔ میں نے کہا کہ اس کے لیے مضامین چاہئیں، وہ کہاں سے آئیں گے۔ انھوں نے کہا کہ تم اس کی فکر مت کرو، میں نے انتظام کر لیا ہے۔ اور واقعتاً انھوں نے انتظام کر لیا تھا۔ سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال سے لے کر پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، عنوان چشتی، مظہر امام، خلیق انجم، مخمور

سعیدی، وزیر آغا، نثار احمد فاروقی، مصور سبزواری، حامدی کاشمیری، ظہیر غازی پوری، اعجاز علی ارشد، مناظر عاشق ہرگانوی، عبدالصمد، صلاح الدین پرویز، صادقہ ذکی اور راشد انور راشد سمیت متعدد قلمکاروں، ادیبوں اور شاعروں کے مضامین کا بنڈل انھوں نے مجھے تھما دیا اور کہا کہ لو انھیں ترتیب دے دو۔ میں نے ترتیب دے دیا اور اس طرح کتاب نما کا جون 2004 کا شمارہ حنیف ترین پر خصوصی شمارہ تھا۔ اس کا عنوان تھا ''حنیف ترین: فن اور شخصیت''۔ بطور مرتب میں نے ان کی شاعری پر ایک طویل مضمون قلمبند کیا تھا۔ اس دوران انھوں نے مکتبہ جامعہ کے اسٹاف کو نوازا بھی۔ ان کو کسی سے بھی مضمون لکھوانے کا ملکہ حاصل تھا۔ ایسا انداز اختیار کرتے کہ چار و ناچار لکھنا ہی پڑتا۔ جسے پکڑ لیتے اس کے سامنے جائے مفر نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کسی نے بدرجہ مجبوری نہیں لکھا۔ بلکہ جس نے بھی لکھا ان کی شاعری اور شخصیت سے متاثر ہو کر لکھا۔ یہ بھی ایک سچائی ہے کہ انھوں نے کسی سے مفت میں مضمون نہیں لکھوایا۔ جس سے بھی لکھوایا اسے نوازنے میں بخالت سے کام نہیں لیا۔

ان دنوں میں ذاکر نگر ویسٹ میں ایک کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ لیکن میں نے ان کے لاکھ اصرار کے باوجود ان کو اپنا گھر نہیں دکھایا۔ میں جانتا تھا کہ اگر ایک بار انھوں نے دیکھ لیا تو جب جی چاہے گا دوڑے چلے آئیں گے۔ میرا چھوٹا سا گھر کہاں بٹھاؤں گا، کہاں کیا کروں گا۔ لیکن میں نے ان کی ایک خواہش پوری کر دی۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے خطوط اور تخلیقات اخبارات و رسائل میں بھیجنے کے لیے تمھارا پتہ استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ضرور کیجیے۔ اس طرح وہ برسوں تک میرا پتہ استعمال کرتے رہے ہیں۔

جب 2014 میں وہ ہندوستان واپس آگئے تو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تکونہ پارک اور اوکھلا ہیڈ کے درمیان واقع یونیورسٹی کے قریب تعمیر شدہ ایک عمارت میں ایک فلیٹ لے لیا تھا۔ وہاں بھی دو ایک بار میری آمد و رفت رہی۔ تاہم زیادہ تر جوگابائی والے فلیٹ ہی میں ملاقات ہوتی۔ ان کی اہلیہ مجھ سے بڑی شفقت سے پیش

آتیں۔ 2017 میں میں اپنی اہلیہ کے ساتھ عمرہ کی ادائیگی کے لیے گیا تھا۔ جانے سے قبل میں نے بٹلہ ہاؤس چوک کے پاس کھجوری روڈ پر واقع ان کے کلینک میں اپنی اہلیہ کے ساتھ ڈاکٹر شمیم صاحبہ سے ملاقات کی اور ان سے کچھ دوائیں لکھوائیں۔ اس سے قبل وہ اپنے فلیٹ میں ان سے مل چکی تھیں۔ وہ میری اہلیہ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ اس کلینک میں شام کے وقت کبھی وہ بیٹھتی تھیں اور کبھی حنیف ترین صاحب۔ لیکن پابندی سے کوئی نہیں بیٹھتا تھا۔ دونوں کی اپنی مصروفیات تھیں۔ اس لیے وہاں مریضوں کو میں نے بہت کم دیکھا۔ ہندوستان آنے کے بعد انھوں نے دہلی کے مشہور اسپتال اپولو میں کچھ دن اپنی خدمات پیش کیں۔ مگر پھر اسے چھوڑ دیا۔ پھر ہیفکو میڈیکل اسکریننگ سینٹر نیو فرینڈس کالونی میں خدمات انجام دیں۔ اسے بھی چھوڑنا پڑا۔ دراصل ان کا جو مزاج تھا وہ انھیں کہیں ٹکنے نہیں دیتا تھا۔ اور چونکہ وہ سعودی عرب میں کئی دہائیوں تک خدمات انجام دے چکے تھے اس لیے ہندوستان کے اسپتال ان کے معیار پر کھرے نہیں اترتے تھے۔ میں جب بھی ان کے کلینک کے سامنے سے گزرتا تو یہ دیکھنے کی کوشش کرتا کہ وہ ہیں یا نہیں۔ ہوتے تو ان سے مل لیتا۔ اسی درمیان انھوں نے ایک ادبی تنظیم بھی بنالی تھی۔ جس کا نام ''عالمی اردو مجلس'' تھا۔ لیکن اس کے تحت وہ جو پروگرام کرتے یا شعری نشست منعقد کرتے تو وہ بالکل ہی مقامی ہوتی۔ ان کے حلقے میں آخری دنوں میں شامل ہونے والے شاعر و صحافی اور اپنے دوست بسمل عارفی سے میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب تو عالمی تنظیم بنائے ہوئے ہیں اور پروگرام مقامی کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ چونکہ خود عالمی ہیں اس لیے تنظیم بھی عالمی بنائی ہے۔ انھوں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اگر چہ یہ جملہ طنزیہ تھا لیکن حقیقت پر مبنی تھا۔ ادب و شاعری کی دنیا میں وہ عالمی شہرت رکھتے تھے۔

مارچ 2018 میں میرے چھوٹے بھائی ڈاکٹر شمس کمال انجم، صدر شعبۂ عربی بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری، جموں کو ان کی یونیورسٹی کی جانب سے ایک باوقار ایوارڈ ملا۔ وہ دہلی آئے تو میرے گھر پر ان کے اعزاز میں ایک شعری نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں پروفیسر خالد محمود، پروفیسر کوثر مظہری، سید منصور آغا اور حقانی القاسمی سمیت

متعدد شعرا، ادبا اور صحافیوں نے شرکت کی تھی۔ حنیف ترین صاحب بطور خاص تشریف لائے تھے۔ ان کے انتقال پر میں نے حقانی القاسمی سے اظہار تعزیت کیا اور سید منصور آغا نے مجھ سے کیا۔ کہنے لگے کہ مجھے دہلی میں آپ ہی ایسے لگے جس سے میں ڈاکٹر صاحب کے انتقال پر اظہار تعزیت کروں۔ ایک بار ڈاکٹر صاحب نے اپنے گھر پر منعقدہ ایک تقریب میں مجھے اس لیے بطور خاص مدعو کیا کہ اس میں راجوری سے کم و بیش ایک درجن افراد نے شرکت کی تھی۔ وہ لوگ کسی کام سے دہلی آئے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے مہمان تھے۔ اس سال دہلی کی ایک ادبی تنظیم ''اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن'' کی جانب سے 9 نومبر کو عالمی یوم اردو کے موقع پر ہمارے والد مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم پر ایک یادگار مجلہ شائع کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر پر ہونے والی مذکورہ نشست میں اس مجلے کا اجرا عمل میں آیا تھا۔ وہ ہم تین بھائیوں (حماد انجم (مرحوم)، سہیل انجم اور ڈاکٹر شمس کمال انجم) سے بہت محبت کرتے تھے اور اکثر و بیشتر ہمارے خاندان کی علمی خدمات کا ذکر خیر کرتے۔

ہر شخص میں کچھ خوبیاں ہوتی ہیں تو کچھ خامیاں۔ انسان ان دونوں اوصاف کا مرکب ہے۔ ان میں بھی خوبیاں اور خامیاں دونوں تھیں۔ ان کے مزاج کی ہنگامہ خیزی کے سبب بہت سے گوشہ گیر یا تنہائی پسند لوگ انھیں پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس سے وہ انکار بھی نہیں کر سکتے کہ حنیف ترین ایک مخلص شخص کا نام تھا۔ ہندوستان آنے کے بعد انھوں نے بہت کوشش کی کہ انھیں کل ہند سطح کے مشاعروں میں پڑھوایا جائے۔ وہ لال قلعہ کے مشاعرے میں بھی پڑھنے کے مشتاق تھے۔ لیکن ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ اگر انسان کو کسی کی موت کی تاریخ پیشگی معلوم ہو جائے تو وہ چاہے گا کہ اس کی وہ خواہشیں پوری کر دی جائیں جن کی تکمیل کے لیے وہ تڑپ رہا ہے۔ لیکن قدرت نے اس کا انتظام ہی نہیں کیا ہے۔ حالانکہ وہ بہت اچھے شاعر تھے۔ لیکن ان کے مزاج کا الھڑ پن ان کے راستے میں حائل ہو جایا کرتا تھا۔

انھوں نے فلسطین کے جیالوں پر ایک طویل نظم لکھی تھی ''باغی سچے ہوتے ہیں''۔

زبردست نظم ہے۔ اس میں فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم کو مختلف پیرایوں میں نظم کیا گیا ہے۔ ان کے متعدد شعری مجموعے شائع ہوئے جن میں رباب صحرا، کتاب صحرا، کشت غزل نما، زمین لاپتہ رہی، ابابیلیں نہیں آئیں، زلزال، روئے شمیم (اس مجموعہ کا نام انھوں نے اپنی اہلیہ کے نام پر رکھا تھا)، لالۂ صحرائی، پس منظر میں منظر بھیگا کرتے ہیں اور دلت کویتا جاگ اٹھی۔ انھوں نے ہندی میں بھی شاعری شروع کر دی تھی جس کے نتیجے میں ستیہ میوٗ جیتے اور دلت آکروش کے نام سے دو کتابیں منظر عام پر آئیں۔ انھوں نے معروف شاعر وادیب ظہیر غازی پوری کی شخصیت اور ان کے فن پر ایک کتاب بھی مرتب کی تھی۔ یہاں یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ ان کے مجموعے کتاب صحرا کا عربی میں ترجمہ ڈاکٹر شمس کمال انجم نے کیا تھا اور اس کا عربی نام تھا ''بعیداً عن الوطن''۔ آجکل ڈاکٹر صاحب اخباروں میں کالم لکھنے لگے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس دن روزنامہ انقلاب میں ان کا کالم چھپا اسی دن ان کا انتقال ہوا۔

ادھر کئی مہینوں سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کشمیر چلے گئے۔ وہیں انھوں نے آخری سانس لی۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریق رحمت کرے اور ان کی اہلیہ اور ان کے بیٹوں اور بیٹی کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ میں ڈاکٹر شمیم اختر صاحبہ اور ان کی اولاد کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ ان کا جانا میرا بھی ایک ذاتی خسارہ ہے۔ حنیف ترین جیسی طوفان بردوش شخصیت کا دہلی کے ہنگاموں سے دور اس طرح خاموشی سے چلا جانا انتہائی تکلیف دہ ہے۔

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

دسمبر 2020

OO

رضوان احمد

جب 31 مئی 2011 کو بعد نماز مغرب پٹنہ کے ہمارے دوست جناب عطا عابدی نے یہ منحوس خبر سنائی کہ بھائی رضوان احمد اب اس دنیا میں نہیں رہے تو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ یہ خبر متوقع تھی اور سچ بات تو یہ ہے تقریباً تین ماہ قبل جب سے دہلی کے ایک اسپتال میں جگر کے آپریشن کے بعد وہ پٹنہ گئے تھے اسی وقت سے اس بری خبر کے آنے کا اندیشہ تھا جو بالآخر آ کر رہی۔ انتقال سے محض ایک ہفتہ قبل تک ان سے فون پر بات ہوتی رہی ہے۔ آخری گفتگو میں بھی ہمیشہ کے مانند ادبی، سیاسی، صحافتی اور دیگر موضوعات پر انھوں نے اظہار خیال کیا۔ مگر ان کے انداز گفتگو اور پر اعتماد لہجے کی وجہ سے یہ اندازہ لگا پانا مشکل تھا کہ وہ بس چند دنوں کے ہی مہمان ہیں اور یہ بات چیت آخری بات چیت ثابت ہوگی۔

29 مئی کی شام کو حیدر آباد کے اُردو روزنامہ سیاست سے وابستہ ہمارے دوست رشید الدین نے یہ اطلاع دی تھی کہ رضوان صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اسپتال میں داخل ہیں، ان کے پیٹ میں پانی جمع ہو رہا ہے جسے ڈاکٹر نکال رہے ہیں۔ اس اطلاع پر ذہن کے کسی گوشے میں کرچیاں سی چبھتی محسوس ہوئی تھیں۔ کیونکہ میں نے کینسر میں مبتلا اپنے ایک عزیز کو دیکھا تھا کہ آخری وقتوں میں ان کے بھی پیٹ میں پانی جمع ہونے لگا تھا جسے نکالنے کے بعد ڈاکٹروں نے فیصلہ سنا دیا تھا کہ بس اب چند دنوں کا معاملہ ہے۔ ڈاکٹروں کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی تھی۔ لہٰذا اس تجربے کی روشنی میں

میں نے رشید الدین سے کہا کہ بھائی اب تو یہ معاملہ زیادہ دنوں کا نہیں لگتا، بری خبر کے لیے تیار رہیے گا۔ وہی ہوا، دو روز بعد بری خبر آ ہی گئی۔ لیکن ان کے انتقال کے بعد کئی دنوں تک میں رضوان بھائی کی اہلیہ اور بیٹی سے رابطہ قائم نہیں کر سکا۔ ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ سوچتا تھا کیا کہوں گا۔ ہم لوگوں کے پاس کیا ہے سوائے چند رسمی جملے ادا کرنے کے۔ لیکن بہر حال رسمی جملوں کی ادائیگی بھی رسم دنیا ہے اور خواہی نخواہی یہ رسم ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔ حالانکہ ایسے وقت میں پرسہ دینے والا خود کو کتنا بے بس اور لاچار محسوس کرتا ہے یہ وہی جانتا ہے۔ چونکہ رضوان صاحب کئی سالوں تک پٹنہ سے وائس آف امریکہ اُردو کی نمائندگی کرتے رہے ہیں اس لیے انتقال کی اطلاع میں نے فوراً وائس آف امریکہ کو میل کر دی۔ دو تین روز بعد وہاں کے سینئر نیوز براڈ کاسٹر اور ہم لوگوں کے مشترکہ دوست جناب رضی احمد رضوی صاحب کا فون آیا اور انھوں نے بہت سی تفصیلات معلوم کر کے ایک تعزیتی مضمون قلمبند کیا جو وائس آف امریکہ کی اردو ویب سائٹ پر موجود ہے۔

رضوان احمد سے راقم الحروف کا تعلق تقریباً پندرہ برسوں سے تھا۔ فروری 2002 میں گجرات میں بھیانک مسلم کش فسادات کے بعد جب وائس آف امریکہ اردو نے ہندوستان میں اپنی نشریات کو فروغ دینے کے لیے نمائندوں کی تقرری کی تو پٹنہ سے ان کی تقرری عمل میں آئی جو تقریباً آخر وقت تک جاری رہی۔ ان سے ملاقات تو اس تقرری کے پہلے سے تھی البتہ قربت اس کے بعد ہی پیدا ہوئی۔ فون پر تو مسلسل گفتگو ہوتی ہی رہی، وہ جب بھی دہلی آتے تو مطلع کرتے اور پھر ہم لوگوں کی مجلس جمنے لگتی تھی۔ 2008 میں ان کے اکلوتے بیٹے محمد سفیان کا دہلی کی جامعہ ہمدرد میں داخلہ ہو گیا تھا۔ انھوں نے مجھے فون کیا کہ سفیان کے لیے کوئی جگہ کرائے پر دلوا دوں جو جامعہ ہمدرد کے قریب ہو۔ ہم نے اپنے ایک دوست ضیاء الرحمٰن انصاری سے، جو کہ ایم ٹی این ایل میں اسسٹنٹ ویجلینس آفیسر ہیں اور جامعہ ہمدرد کے قریب سنگم وہار میں جن کا مکان ہے، اس سلسلے میں بات کی۔ انھوں نے اپنے ایک اور مکان میں جو کہ بن کر تیار ہو رہا تھا سفیان کے لیے کمرہ مخصوص کر دیا۔ اس کے بعد تو وہ اکثر و بیشتر آنے جانے لگے۔

اسی درمیان 2009 میں وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے گئے۔ لیکن ان کو کیا پتہ تھا کہ اللہ تعالیٰ واپسی پر ان کو ایک بڑی آزمائش میں ڈالنے والا ہے۔ سفیان کی طبیعت خراب ہوگئی، پیروں میں خطرناک پھوڑے نکل آئے۔ لیکن امتحان کی تیاریوں کے سبب اس نے کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو ''مائیگرین'' ہوگیا۔ یعنی پھوڑوں کے توسط سے پورے جسم میں زہر پھیل گیا اور پہلے دہلی اور پھر پٹنہ میں علاج کا کوئی فائدہ نہیں ہوا اور یکم جنوری 2010 کو جواں سال سفیان کا انتقال ہوگیا۔ رضوان صاحب کا کالم ''مجھے بولنے دو'' بہت مشہور تھا اور ملک کے مختلف اُردو روزنامہ اخباروں میں شائع ہوتا تھا۔ سفیان کے انتقال کی پہلی برسی پر انھوں نے جو مضمون لکھا تھا اس کا عنوان تھا ''مجھے چپ رہنے دو''۔

سفیان کے چلے جانے کے بعد وہ، ان کی اہلیہ اور ان کی اکلوتی بیٹی ارم سب اندر سے ٹوٹ سے گئے تھے لیکن باہر سے سب کچھ ٹھیک ٹھاک لگتا تھا۔ یہ ان کے بلند حوصلے کی زندہ مثال تھی۔ سفیان کے جانے کے بعد وہ بیمار رہنے لگے۔ ان کو یرقان ہوگیا جو چھ سات مہینے تک ٹھیک نہیں ہوا۔ پٹنہ میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کا جگر خشک ہوگیا ہے اور اس کا علاج لکھنؤ میں ہوسکتا ہے یا دہلی کے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (ایمس) میں۔ وہ دہلی آگئے اور جامعہ نگر علاقہ میں نیر منزل میں اپنے ایک رشتے دار کے گھر ٹھہر گئے۔ وہاں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایمس کے ڈاکٹروں نے پہلے تو کہا کہ آپریشن سے مرض ٹھیک ہو جائے گا لیکن بعد میں ڈاکٹروں کے پینل نے متعدد ٹیسٹ کے بعد آپریشن نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ دراصل ان کو جگر کا کینسر ہوگیا تھا جس کی وجہ سے جگر ساٹھ فیصد یا اس سے زیادہ خشک ہوگیا تھا۔ ان کو جگر خشک ہونے کی بات تو بتائی گئی لیکن کینسر کے بارے میں نہیں بتایا گیا۔ انھیں ایمس کے پرائیویٹ وارڈ میں داخل کر لیا گیا اور ایک مہینے سے زائد تک وہ وہاں رہے۔ وہاں ان کے مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے۔ بالآخر ڈاکٹروں نے انہیں ڈسچارج کر دیا۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے دہلی کے ہی ایک لیور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں دکھایا۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے بھی

وہی بات بتائی لیکن یہ بھی کہا کہ لیور اتنا خشک نہیں ہوا ہے جتنا کہ ایمس کے ڈاکٹروں نے بتایا ہے۔ انھوں نے آپریشن کا فیصلہ کیا لیکن شکم چاک کرنے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ یہ کیس آپریشن کے لائق نہیں تھا۔ بہرحال آپریشن کے چند دنوں کے بعد ان کو چھٹی دے دی گئی اور ان کے عزیزوں سے کہہ دیا گیا کہ انھیں گھر لے جائیں۔ جس روز ان کو گھر جانا تھا، راقم الحروف اور انصاری صاحب نے نیر منزل جا کر ان سے ملاقات کی۔ اس وقت بھی ان کے انداز گفتگو میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ ہمیشہ کی طرح اُردو اخباروں اور ملکی وبین الاقوامی سیاست پر گفتگو کرتے رہے۔ یہ تقریباً تین ماہ پہلے کی بات ہے۔ وہ رضوان صاحب سے میری آخری ملاقات تھی۔

ڈاکٹر رضوان احمد متعدد خوبیوں کے مالک تھے۔ وہ ایک صحافی، ادیب، افسانہ نگار اور تنقید نگار تو تھے ہی، ایک بہت اچھے انسان بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو ان سے ایک بار مل لیتا ان کا دوست بن جاتا۔ حلاوت آمیز لہجہ، محبت آمیز گفتگو اور خلوص کے پیکر میں ڈھلا ڈھلایا مزاج ملنے والوں کو اپنا گرویدہ بنالیتا تھا۔ دس بیس سال بعد بھی کوئی ملتا تو اس کو وہی اپنائیت دکھائی دیتی جو پہلے تھی۔ وہ اپنی نیک نفسی، انکساری، نرم گوئی اور کردار میں رچی بسی انسانیت کی وجہ سے ملاقاتیوں اور دوستوں کے حلقوں میں کافی مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ وہ ہر موضوع پر گفتگو کا فن جانتے تھے اور ہر شخص سے نباہ کرنے کے ہنر میں یکتا تھے۔ اردو ادب کے دو روایتی حریفوں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمٰن فاروقی دونوں سے ان کی دوستی تھی اور دونوں ان کو عزیز رکھتے تھے۔ وہ کسی خیمے یا گروپ کے ساتھ بندھ کر رہنا پسند نہیں کرتے تھے اور نہ ہی کسی کے سلسلے میں بدگوئی سے کام لیتے تھے۔ سیاست دانوں سے بھی ان کے بہت اچھے مراسم تھے اور ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں سے بھی دوستی تھی۔ وہ جتنا عمدہ سیاسی مضمون لکھتے تھے اتنا ہی معیاری ادبی مضمون بھی لکھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے انتقال سے صحافت کے ایک عہد کا خاتمہ تو ہوا ہی ہے ادبی دنیا بھی اپنے ایک ذی علم سپوت سے محروم ہوگئی ہے۔ انھوں نے میری ایک کتاب ''مغربی میڈیا اور اسلام'' پر مقدمہ تحریر کیا تھا جس کا عنوان انھوں

نے ''بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی'' رکھا تھا۔

ممبئی کے اُردو روزنامہ اُردو ٹائمس کے سابق ایگزیکٹو ایڈیٹر اور اب لکھنؤ کے روزنامہ ''اودھ نامہ'' کے گروپ ایڈیٹر جناب عالم نقوی صاحب نے ان کے انتقال پر ایک دل سوز اداریہ تحریر کیا ہے اور بجا طور پر لکھا ہے کہ ''ان کا میدان تحریر صرف عصری، سیاسی و سماجی موضوعات ہی نہیں علم وادب بھی تھا۔ ان کے ادبی وتنقیدی مضامین اور افسانوں کے دو مجموعے ان کا بیش بہا ورثہ ہیں، انھوں نے جیسی سرگرم ادبی وسماجی زندگی گزاری بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ابھی ان کے سیکڑوں کالم، ادبی مضامین اور افسانے کئی ضخیم اور وقیع کتابوں میں تبدیل ہونے کے منتظر ہیں جو اپنے عہد کی تاریخ کا مستند حوالہ ہوں گے''۔ عالم نقوی صاحب نے ان کے بارے میں ان کے کالم کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''مجھے بولنے دو'' کی صدا لگانے والا اردو کا مجاہد خاموش ہوگیا۔

وائس آف امریکہ واشنگٹن کے رضی احمد رضوی ان سے ملاقات کے لمحات کو یاد کر کے لکھتے ہیں کہ ''رضوان احمد سے ہماری ملاقات پٹنہ میں ہمارے مشترک دوست اور کرم فرما جناب م۔ افضل اور مودود صدیقی کے توسط سے 1998 میں ہوئی تھی...... کافی طویل گفتگو رہی اور ان کے علم، ان کی نرم گفتاری اور خلوص کا ایسا تاثر لے کر اٹھے جس نے ہمیں ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ بنا دیا۔ اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ پہلی ملاقات دراصل آخری ملاقات ہوگی اور محض یادیں رہ جائیں گی اور ان کے لب ولہجے کی شائستگی بس کانوں میں گونجتی رہے گی''۔ انہوں نے وائس آف امریکہ کی اردو ویب سائٹ کے لیے متعدد ادبی مضامین لکھے تھے جو انتہائی معیاری تھے اور جن کی تعداد بہر حال سو سے اوپر ہوگی۔

رضوان احمد اتر پردیش کے معروف شاعر جناب غبار بھٹی کے بیٹے تھے اور ان کی پیدائش 9 رستمبر 1947 کو اتر پردیش میں بارہ بنکی کے نزدیک قصبہ موئی میں ہوئی تھی لیکن انھوں نے پٹنہ کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز پٹنہ کے روزنامہ عظیم آباد ایکسپریس سے ہوا تھا۔ ان کا معروف کالم ''مجھے بولنے دو'' اردو ٹائمز ممبئی، اعتماد

حیدر آباد، آگ لکھنؤ، قومی تنظیم پٹنہ اور جدید خبر دہلی میں پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ ممبئی کے روزنامہ انقلاب اور دیگر اخباروں اور ادبی رسالوں میں بھی ان کے مضامین چھپتے رہے ہیں۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے ''آزادی کے بعد اُردو صحافت'' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی تھی اور ان کی تصنیفات میں ''یونان کی شہزادی، مسدود راہوں کے مسافر، بادل چھٹ گئے، فصیل شہر اور مجھے بولنے دو'' خاصے مقبول ہوئے تھے۔ وہ صحافتی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے اور 1976 میں وہ اس کے تنظیمی سکریٹری بنائے گئے تھے۔ انھیں اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال کی اُردو اکیڈمیوں نے ایوارڈوں سے نوازا تھا۔ وہ بہار اردو اکیڈمی کے دو بار ممبر سکریٹری بھی بنائے گئے تھے۔ ان کا انتقال جہاں ان کے پسماندگان کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے وہیں اردو صحافت اور ادب کا بھی بڑا نقصان ہے۔

جون 2011

OO

مولانا صادق بستوی

کیا خبر تھی کہ اگلا کالم پھر ایک تعزیت نامہ ہوگا۔ وقت اپنی زنبیل سے کب کیا نکال کر دنیا کے سامنے رکھ دے، کہا نہیں جا سکتا۔ ابھی ہم مولانا عبدالرشید بستوی اور مولانا اسرار الحق قاسمی ایم پی کے غموں سے باہر بھی نہیں نکل پائے تھے کہ ایک اور غم جسے ''غمِ صادق'' کہیے ہمارے استقبال کو آ موجود ہوا۔ مولانا صادق علی قاسمی بستوی دریابادی بھی اسی راہ کے راہی ہو گئے جس پر لوگ جاتے تو ہیں مگر واپس نہیں آتے۔ اپنے وطن کے حالیہ سفر میں ہم نے تین دسمبر 2019 کو مولانا مجیب بستوی اور بعض دیگر احباب کے ہمراہ ان کے دولت خانہ، لہرولی ضلع سنت کبیر نگر پر جا کر شرف نیاز حاصل کیا تھا۔ گفتگو کے دوران ہم نے ان کے سامنے اپنی یہ خواہش رکھی کہ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ اپنے رسالہ ماہنامہ ''نقوش حیات'' کے اداریوں کو ترتیب دے دیں اور اسے شائع کر دیا جائے۔ انھوں نے خوشی ظاہر کی اور اس کی ساری ذمہ داری خاکسار کو تفویض کر دی اور میں نے بھی بخوشی قبول کر لی۔ انتقال سے دو روز قبل ان سے بذریعہ فون گفتگو ہوئی اور انھوں نے بتایا کہ اداریے یکجا کر لیے گئے ہیں اور جلد ہی بذریعہ ڈاک دہلی بھیج دیے جائیں گے۔ 15/دسمبر کو صبح تقریباً پونے گیارہ بجے ان کے موبائل نمبر سے کال آئی تو فطری طور پر یہی خیال آیا کہ مولانا اداریوں کے سلسلے میں کوئی بات کریں گے۔ لیکن جب ایک قدرے نامانوس اور لرزیدہ سی آواز سنائی دی تو دل دھڑک اٹھا۔ لائن پر ان کے بڑے بیٹے خالد کمال تھے۔ انھوں نے ایسی جان کاہ خبر سنائی جس کو سننے کے لیے دل ابھی تیار نہیں تھا۔

خبر نا قابل یقین تھی لیکن یقین کرنا ہی پڑا۔ کوئی بیٹا اپنے باپ کے سلسلے میں اس قسم کی کوئی غلط خبر نہیں دے گا۔

جب کچھ گھنٹوں کے بعد طبیعت بارِ غم سے ذرا ہلکی ہوئی تو یادوں کے دریچے وا ہو گئے۔ ان سے بے شمار ملاقاتوں کے مناظر ذہن کے پردے پر فلم کی مانند چلنے لگے۔ ان کی محبت آمیز باتیں، ان کا خلوص، ان کی خاکساری وانکساری، ان کی علمیت اور اس پر سادگی کا پرتو، چند سال قبل دہلی میں غریب خانے پر تشریف لا کر خاکسار کو شرف مہمان نوازی بخشنا سب کچھ یاد آنے لگا۔ دل نے کہا کہ وہ علاقہ جو اہل علم کا علاقہ کہلاتا ہے اب سُونا ہوتا جا رہا ہے۔ جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں۔ چند برسوں کے اندر وہاں کی کم از کم چار بڑی شخصیات، جو اسی علاقے میں علمی سرگرمیوں میں مصروف تھیں، اٹھ گئیں۔ مولانا صادق بستوی سے قبل معروف مسلم اکثریتی قصبہ امرڈوبھا میں واقع بریلوی مکتب فکر کے ایک مرکزی ادارہ مدرسہ تنویر الاسلام کے مفتی اور مرجع خلائق مولانا نظام الدین، لوہرسن بازار (کرنجوت) کے اہلحدیث مکتب فکر کے معروف عالم دین، خطیب، ادیب، شاعر وصحافی مولانا حامد الانصاری انجم اور موضع لوہرسن کے دیوبندی مکتب فکر کے عالم، خطیب، ادیب اور شیخ الحدیث اکیڈمی دیوبند کے سابق محقق اور جمعیۃ علماء کے ضلعی صدر مولانا عبد الحفیظ رحمانی ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ اب مدرسہ بیک گراؤنڈ کے جو علما سرمایۂ ملت کا درجہ رکھتے ہیں ان میں مدرسہ دار العلوم بستی کے صدر مدرس مولانا نثار بستوی، جامعہ اسلامیہ دریاباد کے بانی اور عالم اسلام کی معروف علمی شخصیت مولانا عبد الباری فتح اللہ (ریاض)، جامعہ ہذا کے ناظم ماہنامہ استدراک کے مدیر اور معروف شاعر وادیب مولانا عتیق اثر ندوی، سمریاواں کے معروف عالم دین اور شاعر مولانا مجیب بستوی، مولانا وقار احمد، جامعہ اشرفیہ مبارکپور کے نائب ناظم قصبہ مہداول کے مولانا ادریس بستوی جو کہ ایک سیاسی شخصیت بھی ہیں، موضع مڑلا کے مولانا عتیق بستوی استاد ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مولانا شبیر احمد مونڈاڈیہہ قابل ذکر ہیں۔ یہ علاقہ انگریزی داں طبقہ کا بھی ایک مرکز ہے۔ موجودین میں مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے

سابق طالب علم لیڈر رافسر یو احمد کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جبکہ سیاسی شخصیات کی بھی کمی نہیں رہی۔ کسی زمانے میں نبی خاں ایم ایل اے کا بڑا شہرہ تھا۔ یہ خطہ مجاہدین آزادی کا بھی مرکز رہا ہے۔

بارہ بنکی کے دریاباد کے مانند سنت کبیر نگر کا دریاباد بھی علم وادب کا ایک گہوارہ ہے۔ مولانا رحم اللہ خلیفۂ مجاز حضرت مولانا سخاوت علی جونپوری اور مولانا زین اللہ زین (صاحب دیوان فارسی) دریاباد ہی کے سپوت تھے۔ مولانا عبدالباری اور مولانا عتیق اثر کے مانند مولانا صادق کی جائے پیدائش بھی یہی سرزمین علم وفن ہے۔ بعد میں انھوں نے قریب ہی میں واقع لہرولی بازار میں جو کہ مہداول اور بستی کے درمیان ایک قدیم شاہراہ پر واقع ہے، اپنا مسکن بنالیا تھا جو ہر خاص وعام کے لیے مرجع خلائق تھا۔ مولانا فاضل دیوبند تھے۔ پنجاب یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی، الٰہ آباد بورڈ اور جامعہ اردو علیگڑھ سے بھی فیض یافتہ تھے۔ علمی میدان میں ان کا قد جتنا بلند تھا اتنی ہی ان کے اندر عاجزی و خاکساری تھی۔ کوئی بھی کسی بھی قسم کا مسئلہ پیش کرتا وہ فوراً عقدہ کشائی کر دیتے۔ ہمیشہ قمیص اور لنگی ہی زیب تن کرتے۔ یہاں تک کہ جب نئی دہلی میں واقع سعودی سفارتخانہ نے دو سال قبل ان کو ضیوف خادم حرمین میں شامل کر کے فریضۂ حج کی ادائیگی پر بھیجا تو وہاں بھی وہ اسی لباس میں گئے۔

وہ ایک عظیم انسان تھے تو ایک عظیم شاعر بھی تھے۔ مولانا ولی رازی کی کتاب "ہادی عالم" کے طرز پر 232 صفحات پر مشتمل غیر منقوط منظوم سیرت "داعی اسلام" حفیظ جالندھری کے شاہ نامہ اسلام کے انداز میں منظوم کی۔ اس کتاب کو پوری دنیا میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ مولانا تقی عثمانی، شیخ الحدیث کراچی مولانا سلیم اللہ خاں، مولانا ابوالحسن علی ندوی، قاضی اطہر مبارکپوری، حکیم عبدالحمید، قاری صدیق، ناز انصاری، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی کراچی، ڈاکٹر محمود الٰہی، مولانا عارف سراجی اور دیگر متعدد اہلِ علم نے اس کاوش کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ جبکہ ہادی عالم کے مصنف مولانا ولی رازی نے اس کتاب پر خوشی ظاہر کی اور اس کو اپنے لیے سعادت تصوّر کیا۔ چونکہ

''داعی اسلام'' غیر منقوط منظوم ہے اس لیے اس کے ٹائٹل پر بھی مولانا نے انوکھا پن دکھایا ہے۔ اس پر درج ہے ''داعی اسلام کلام معرائے اردو'' محرر ص علی ص۔ ان کے مکتبے کا نام ''خالد کمال اشاعت گھر'' ہے۔ اس کو بھی انھوں غیر منقوط لکھا ہے۔ یعنی کمال دارالرسائل لہرولی۔ آپ کے تتبع میں کئی شعراء نے غیر منقوط نظمیں لکھنے کی کوشش کی مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

نظم ونثر میں آپ کی تقریباً بیس کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ آپ 23/ برسوں سے اردو ماہنامہ ''نقوش حیات'' نکال رہے تھے۔ اس کے اداریے بڑے جاندار اور بامعنی ہوتے۔ ان کی نظر ملکی حالات پر تو بڑی گہری تھی ہی عالمی حالات پر بھی تھی۔ آپ روزنامہ راپتی گورکھپور کے مدیر، روزنامہ اردو ٹائمس ممبئی، مشرقی آواز گورکھپور اور روزنامہ قومی آواز لکھنؤ کے نامہ نگار بھی رہے۔ جمعیۃ علماء ضلع بستی کے جنرل سکریٹری، جمعیۃ علماء اتر پردیش کے سابق سکریٹری اور جامعہ خادم الاسلام ہاپوڑ، مدرسہ اطہر العلوم امرڈوبھا اور جامعہ ہدایت الاسلام کرہی میں استاد کے منصب پر بھی فائز رہے۔ جب جمعیۃ علماء کی جانب سے ملک وملت بچاؤ تحریک چل رہی تھی تو پولیس نے آپ کو گرفتار کر کے تہاڑ جیل میں ڈال دیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی آپ متعدد عہدوں پر فائز رہے ہیں جن میں اتر پردیش اُردو اکیڈمی کی رکنیت بھی شامل ہے۔ صادق بستوی بڑے وسیع المشرب تھے۔ مسلکی تعصب سے کوسوں دور تھے۔ تمام مکاتب فکر میں ان کے چاہنے والے موجود ہیں۔ وہ ہر ایک سے یکساں محبت سے پیش آتے تھے۔ ہر جگہ انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ دوسرے مسالک و مذاہب کو برا بھلا کہنے کے خلاف تھے۔ سیاسی شخصیات سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے۔ ان کے حجرے میں اکثر و بیشتر سیاست دانوں کی آمد و رفت رہتی۔ بچپن انتہائی مفلوک الحالی میں گزرا۔ اب بھی کوئی خاص فارغ البالی نہیں تھی۔ لیکن خودداری اوج کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ وہ اپنی صلاحیتوں اور مالک حقیقی کی کرم فرمائیوں سے آسمان علم وادب پر آفتاب بن کے چمکے۔ انھوں نے آپ بیتی منظوم کی ہے جو بڑی پُرسوز ہے۔ اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

سراپا درد میری داستانِ زندگانی ہے
بڑی ناگفتنی میرے غمِ دل کی کہانی ہے
فریبِ زندگانی میں نے ساری عمر کھایا ہے
حصولِ علم کی خاطر بہت ہی دکھ اٹھایا ہے

دسمبر 2018

OO

مولانا عطاء اللہ خاں

تین اکتوبر 2009 کی صبح کو جب مولانا عطاء اللہ خاں امینی کے انتقال کی خبر ملی تو میں بہت دیر تک اس دلگیر خبر کے زیر اثر رہا اور ایسی بہت سی باتیں ذہن کے پردے پر فلم کے مانند چلتی رہیں جو ان کی یادوں سے وابستہ تھیں۔ مجھے اس خبر پر اس لیے بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ 24/سے 28/ستمبر کے ممبئی کے دورے کے دوران ان سے کافی دیر تک ملاقات رہی۔ میں 25/کو ممبئی پہنچا تھا اور وہاں میری مصروفیت 26/سے 28/ستمبر تک طے تھی۔ لہٰذا میں نے سوچا کہ پہلے بھیونڈی جا کر مولانا سے ملاقات کی جائے۔ اپنی آمد کی اطلاع میں نے ان کو ایک ہفتہ پہلے ہی دے دی تھی اور جب تک میں وہاں پہنچ نہیں گیا وہ بار بار بذریعہ فون یہ معلوم کرتے رہے کہ میں کب آرہا ہوں۔ بہر حال 25/ستمبر کو اپنے ہی گاؤں کے ایک نوجوان شاہ عالم سے میں نے کہا کہ مجھے بھیونڈی جانا ہے اور مولانا عطاء اللہ خاں صاحب سے ملاقات کرنی ہے۔ وہ مجھے بھیونڈی لے گئے جہاں اچپت پاڑہ کی اہلحدیث مسجد میں نماز جمعہ ادا کی گئی۔ جمعہ سے پہلے بھی انھوں نے فون کیا اور جمعہ کے بعد بھی، جب تک کہ میں وہاں پہنچ نہیں گیا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ دن کا کھانا مجھے ان کے یہاں کھانا ہے اور ایک روز قیام بھی کرنا ہے۔ میں نے معذرت طلب کی اور بتایا کہ کھانے کا انتظام کسی اور کے یہاں ہے اور مجھے اسی روز ممبئی چلے جانا ہے۔ نماز جمعہ کے بعد ان کا فون آیا کہ محلے میں کسی کا انتقال ہو گیا ہے، وہ وہیں جارہے ہیں اور میں کب تک پہنچ رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ آپ تعزیت کرلیں میں بس آرہا ہوں۔

ہم اپنے گاؤں کے شاہ عالم کے ساتھ سہ پہر تین بجے ان کے دولت خانے پر پہنچے۔ کافی دیر تک ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ جمعیت و جماعت اہلحدیث سمیت کئی موضوعات زیر گفتگو آئے۔ یہاں تک کہ اچانک موت و حیات کے فلسفے پر بھی بات نکل گئی اور جب نکلی تو بہت دیر تک چلتی رہی۔ اس سلسلے میں ہم دونوں نے مختلف اشعار بھی سنائے کہ دیکھیے اس موضوع پر کیسے کیسے شعر کہے گئے ہیں۔ اس وقت کوئی اندازہ نہیں ہوسکا کہ یہ موضوع ازخود دورانِ گفتگو نہیں آ گیا ہے بلکہ قدرت خود ان سے اس پر گفتگو کروانا چاہتی تھی تاکہ جب ان کے انتقال کی خبر ملے تو زیادہ دھچکہ نہ لگے۔ اس موقع پر انھوں نے ہم لوگوں کی بڑی آؤ بھگت کی۔ لیکن وہ ضیافت میں شریک نہیں ہو رہے تھے۔ جب ہم نے اصرار کیا تو انھوں نے بتایا کہ وہ روزے سے ہیں۔

میں نے یہ تفصیلات اس لیے پیش کی ہیں تاکہ مولانا کے حسن اخلاق کے ساتھ ساتھ حسن کردار اور دوستوں کے ساتھ محبت، مروت، مودت کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔ ان سے میری ملاقات زیادہ پرانی نہیں تھی۔ پہلی بار جمعیت اہلحدیث کی ایک کانفرنس میں، جو کہ ابوالفضل انکلیونئی دہلی میں واقع اہلحدیث کمپلکس میں منعقد ہوئی تھی، ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ پھر وہ جب بھی دہلی آتے ان سے ملنا ضرور ہوتا۔ شاید قدرت کو یہ منظور تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے زیادہ قریب آئیں۔ اس لیے اس نے ایک ایسا انتظام کیا کہ قربت بڑھتی گئی۔ ہوا یوں کہ 2006 میں ہندوستان میں سعودی عرب کے سفارتخانہ نے یہاں سے پچاس افراد کو فریضۂ حج کی ادائیگی پر روانہ کیا تھا۔ اس وفد میں خاکسار کے ساتھ ساتھ مولانا عطاء اللہ صاحب بھی تھے، بلکہ ان کے ساتھ میں بھی تھا۔ اور دلچسپ بات دیکھیے کہ دہلی سے جانے والے وفد میں سے دو افراد کو جن میں ایک میں تھا اور دوسرے ہمارے صحافی دوست خالد انور، ممبئی سے جانا پڑا تھا۔ حالانکہ باقی سب کی پرواز ایک ساتھ دہلی سے ہی ہوئی تھی۔ بہر حال ممبئی سے سعودی عرب جاتے وقت اور حج کے دوران ہم لوگ عموماً ایک ساتھ ہی رہے۔ اس موقع پر مجھے اندازہ ہوا کہ مولانا عام لوگوں کے برعکس پوری تیاری کے ساتھ حج پر گئے تھے۔ ایک ایک باریکی کو بتاتے

اور ایک ایک رکن پر خاص توجہ دیتے۔ انھوں نے بہت سے دوسرے لوگوں کے مانند اس سفر کو ایک پکنک کے طور پر نہیں لیا بلکہ وہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھالینا چاہتے تھے۔ چند لوگوں کے ہمارے گروپ میں، میں نے ان کو سب سے زیادہ عبادت و گریہ وزاری میں مصروف دیکھا۔ خواہ وہ خانۂ کعبہ کا صحن ہو، یا مسجد نبوی کے دالان ہوں یا پھر عرفات کا وسیع و عریض میدان ہو۔ دعا کے وقت ہم لوگ بہت جلد تھک جاتے تھے لیکن مولانا پر ایسی رقت طاری ہوتی تھی کہ انھیں اس کی کوئی خبر ہی نہیں ہوتی تھی کہ ان کے ساتھ آنے والے کب کے جا چکے ہیں۔ میں نے اپنے گروپ میں انھیں سب سے زیادہ خدا ترسی میں مبتلا دیکھا۔

حج سے واپسی کے بعد بھی ان سے بذریعہ فون گفتگو ہوتی اور جب وہ یہاں آتے تو ملاقات بھی ہوتی۔ ایک بار وہ غریب خانے پر بھی تشریف لائے۔ جب میرا سفرنامۂ حج "پھر سوئے حرم لے چل" شائع ہوا تو ان کو اسے پڑھنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ بھیونڈی سے وہ فون پر کہتے کہ ان کے پاس اپنی کتاب ضرور بھیجوں۔ میں نے ان سے کہا کہ جب آپ دہلی آئیں گے تو میں اپنے ہاتھ سے آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ وہی ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد دہلی آمد پر جب میں نے ان کو کتاب پیش کی تو انھوں نے فوراً مطالعہ شروع کر دیا اور دفتر نوائے اسلام کے ذمے داروں کے مطابق جب تک 176 رصفحات پر مشتمل کتاب انھوں نے ختم نہیں کر دی سر نہیں اٹھایا۔ انہوں نے اس کتاب کی بہت تعریف کی اور اس کے انداز نگارش کو بہت سراہا۔

مولانا ایک باکردار شخصیت کے مالک تھے۔ میں نے جمعیت اہلحدیث کی کانفرنسوں میں ان کی تقریریں سنی تھیں۔ وہ بیباک اور بے خوف و بے لاگ تقریر کرتے تھے اور اس کی قطعاً پروا نہیں کرتے تھے کہ ان کی حق گوئی کی زد کس کس پر پڑ رہی ہے۔ ایک تقریر کے دوران جب انھوں نے جمعیت اہلِ حدیث کے کردار پر کھل کر تنقید شروع کی تو میرے قریب بیٹھے ہوئے بعض لوگ، جو کہ خود کسی ریاست کے مقامی ذمے داروں میں سے تھے، دنگ رہ گئے اور بعد میں کئی لوگوں سے یہ کہتے سنا گیا کہ مولانا عطاء اللہ خاں

نے بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ ذمے داروں کا محاسبہ کیا ہے۔

مولانا مرحوم بھیونڈی کی جمعیت اہلحدیث کی ریڑھ کی ہڈی تھے۔ حق گوئی کے باوجود وہ تمام لوگوں میں یکساں مقبول تھے اور بھیونڈی کی جمعیت کو فعال اور سرگرم کرنے میں انھوں نے بہت نمایاں رول ادا کیا تھا۔ وہ مختلف عہدوں پر فائز رہ کر جمعیت کی خدمت انجام دے چکے تھے اور اس وقت بھی کئی ذمے داریاں ادا کر رہے تھے۔ حالانکہ ذریعۂ معاش کے حوالے سے وہ ایک انگریزی تعلیمی ادارے میں استاد تھے لیکن ان کے کردار میں ذرا بھی فرق نہیں آیا اور جمعیت و جماعت کے تعلق سے ان کے خلوص، ان کے درد اور ان کے لگاؤ میں کوئی کمی نہیں آئی۔

آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی یادیں ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کی کارکردگی کے نقوش موجود ہیں۔ اگر بھیونڈی کی جماعت ان کے دکھائے ہوئے راستے پر چلتی ہے اور ان کے قائم کردہ خطوط پر عمل کرتی ہے تو یقیناً اسے کامیاب و کامراں ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

اکتوبر 2009

○○

مولانا عمید الزماں کیرانوی

اگر ہم یہ کہیں کہ دانشوری اور نستعلیقیت ایک جگہ بہت مشکل سے جمع ہوتی ہیں تو شاید بیجا نہیں ہوگا۔ لیکن حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی ایک ایسے دانشور تھے جن کی شخصیت میں یہ دونوں باتیں نہ صرف یکجا تھیں بلکہ ایک دوسرے میں مدغم بھی تھیں۔ ان سے میرا بہت زیادہ تعلق تو نہیں تھا لیکن جو بھی تھا، اس کی روشنی میں میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اب کم از کم دہلی میں کوئی ایسا عالم دین یا مسلم دانشور نہیں ملے گا جس میں بیک وقت یہ دونوں خوبیاں موجود ہوں۔ دانشوری انھیں علم و تجربات کی بدولت ملی تھی اور نستعلیقیت خاندانی تھی۔ ثانی الذکر خوبی کے معاملے میں وہ اپنے برادر محترم حضرت مولانا وحید الزماں کیرانوی کے جانشین تھے۔ ان کے دولت خانے پر جب بھی جانے کا اتفاق ہوا، اسی روایتی میزبانی کا مشاہدہ ہوا جو مولانا وحید الزماں کیرانوی کا طرۂ امتیاز تھا۔ وہ دہلی کی مسلم قیادت کے ایک ایسے ستون تھے جو اپنی انفرادیت کی بنیاد پر سب میں رہ کر بھی سب سے الگ نظر آتے تھے۔ ان کے انداز و اطوار اور ان کے اخلاقی رویے انھیں دوسروں سے ممتاز بناتے تھے۔

سنہ 2006 میں جب سعودی سفارت خانے کے زیر اہتمام ہندوستان کا ایک بڑا وفد فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے گیا تھا تو اس میں خاکسار بھی تھا اور مولانا عمید الزماں صاحب بھی تھے۔ مکہ مکرمہ میں ہم لوگوں کو جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا، حسن اتفاق سے ہم دونوں اس کے ایک ہی کمرے میں تھے۔ اس کمرے میں ڈاکٹر زبیر فاروقی اور ڈاکٹر حبیب اللہ

صاحبان (استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ) بھی تھے۔ اگر چہ وہاں ہم لوگوں کا زیادہ قیام نہیں تھا لیکن جو بھی تھا اس میں مجھے مولانا موصوف کے قریب رہنے اور انھیں دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا اور میں نے ان کی شخصیت کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا اس کا ہلکا سا عکس مذکورہ بالا سطور میں پیش کر دیا گیا ہے۔ اس موقع پر انھوں نے نہ صرف میرے بارے میں مجھ سے بہت سی باتیں معلوم کیں بلکہ اپنے بارے میں اور اپنی سرگرمیوں کے بارے میں بھی بہت سی ضروری باتوں سے باخبر کیا۔

ایک بار جب صبح کے وقت ہم لوگوں کو وہاں سے مدینہ منورہ جانا تھا اور ہمیں حرم شریف کے صحن میں یکجا ہونے کی ہدایت ملی تو ایک بار پھر ان سے سابقہ پڑا۔ ہوا یوں کہ جامع مسجد دہلی کے شاہی امام مولانا سید احمد بخاری اور مولانا موصوف ناشتے کے لیے ایک ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔ جناب احمد بخاری صاحب نے مجھے بھی اشارے سے بلایا اور ہم لوگ وہیں قریب ہی ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ احمد بخاری صاحب نے کچھ کھانے کا آرڈر دیا اور اس کے بعد چائے کی ضرورت پڑی۔ میں نے ایک دوسرے ہوٹل سے چائے لا کر پیش کی۔ لیکن اس ایک کپ چائے سے مولانا کیرانوی کی تشفی نہیں ہوئی اور انھوں نے پھر خود جا کر دوسری چائے لی۔ اس وقت انھوں نے بتایا کہ صبح کے وقت ان کو کئی کپ چائے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور گھر پر وہ انتہائی اطمینان و سکون کے ساتھ چائے کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ حج کے دوران عموماً لوگوں کو نزلے کی شکایت ہو جاتی ہے۔ ہم لوگ بھی اس کی زد میں آ گئے تھے۔ واپس آنے کے بعد ایک بار ان کا فون آیا اور انھوں نے ازراہ مذاق سوال کیا کہ جناب سعودی عرب سے نزلے کی جو سوغات لے کر آئے تھے وہ اب بھی ہے یا ختم ہو گئی۔ اس کے بعد تو اکثر ان سے بذریعہ فون بات ہوتی رہتی یا کہیں نہ کہیں ملاقات ہو جاتی تھی۔

انھیں کہیں سے میڈیا پر میری کتاب ''میڈیا روپ اور بہروپ'' کا علم ہو گیا۔ ایک روز انھوں نے فون کر کے اس کتاب کو پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ان سے ملاقات کا وقت لے کر ہم اور جناب مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب ان کے دولت کدے پر حاضر

ہوئے۔ میں نے ان کی خدمت میں کتاب پیش کی۔ وہ اصرار کرتے رہے کہ میں کتاب کی قیمت لے لوں اور میں انکار کرتا رہا۔ لیکن انھوں نے یہ کہہ کر زبردستی مجھے اس کی قیمت پکڑا دی کہ میں کوئی بھی کتاب مفت نہیں لیتا اور دوستوں اور متعلقین سے تو بالکل ہی نہیں لیتا، یہ میرا اصول ہے۔ میں نے بھی انھیں اپنا اصول توڑنے کا موقع نہیں دیا اور کتاب کی قیمت تبرک سمجھ کر رکھ لی۔ تنظیم ابنائے قدیم کے دفتر میں بھی ان سے ملاقات ہو جاتی اور میں ان کے پاس زیادہ دیر نہیں بیٹھتا کیونکہ وہ کوئی نہ کوئی پریس ریلیز لیے رہتے اور کہتے کہ ذرا آپ اس کو دیکھ لیجئے اور اگر ضرورت ہو تو اصلاح کر دیجیے۔ میں اس سے بچنا چاہتا تھا کہ کہیں ان کو یہ گمان نہ ہو جائے کہ میں نے ان کی تحریر میں خامیاں نکال دیں۔ حالانکہ خامیاں بالکل نہیں ہوتیں لیکن مولانا ازراہ احتیاط ایسی فرمائش کرتے تھے۔ خبروں، بیانوں اور پریس ریلیز وغیرہ کے تعلق سے وہ بہت محتاط واقع ہوئے تھے۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں کہنا چاہتے تھے جس پر اشاعت کے بعد کوئی تنازع ہو جائے یا کوئی اعتراض کر دے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پریس بیانات کو حتمی شکل دینے میں عجلت سے کام نہیں لیتے تھے۔ بیان کے تمام پہلوؤں پر گہرائی سے نظر ڈالتے اور جب وہ یہ سمجھ لیتے کہ ہاں اب یہ بیان برائے اشاعت دینے کے لیے ٹھیک ہو گیا ہے جبھی دیتے تھے۔

ملکی و قومی معاملات اور بالخصوص ملی معاملات پر ان کی نظر رہتی تھی اور اگر کوئی ایسا واقعہ پیش آگیا ہے جس پر ایکشن لینے یا ردعمل ظاہر کرنے کی ضرورت ہے تو وہ فوراً حرکت میں آجاتے تھے۔ مسلم مجلس مشاورت کی میٹنگ بلاتے اور متعلقہ موضوع پر غور وخوض کے بعد لائحہ عمل تیار ہوتا۔ کسی معاملے میں سیاست دانوں سے ملنے یا کسی جگہ کا دورہ کرنے کے لیے وہ ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ مسلم مجلس مشاورت کی تقسیم کے بعد وہ جس مشاورت سے وابستہ تھے، وہ بہت سرگرم اور فعال تھی اور شاید ہی کوئی ایسا ملی مسئلہ ہو جس پر مشاورت کی جانب سے کوئی بیان، کوئی ردعمل نہ آیا ہو یا کوئی عملی قدم نہ اٹھایا گیا ہو۔ لیکن ان تمام معاملات میں وہ احتیاط کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ دہلی میں جب بھی

کوئی بڑا ملی ایشو اٹھتا تو اس میں مولانا کی شرکت ناگزیر ہوتی اور بیشتر ملی جلسوں میں وہ شریک ہوتے۔

ان کی شخصیت میں ایک ندرت تھی ایک نرالا پن تھا اور ایک ایسی انفرادیت تھی جو بہت کم لوگوں میں نظر آتی ہے۔ ان کا رکھ رکھاؤ، ان کی سلیقہ شعاری اور ان کی وضع داری اپنی مثال آپ تھی جو نہ صرف ان کی شخصیت میں جھلکتی تھی بلکہ ان کے کاموں میں بھی نظر آتی تھی۔ ان کے انتقال سے چند روز قبل مشاورت کے ایک رکن ڈاکٹر انوار الاسلام صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے ان کے مرض کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور کہا کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ پھر تو اس درمیان میں ان کے بارے میں اور کوئی خبر نہیں ملی سوائے اس کے کہ وہ گھر پر آ گئے ہیں اور بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔ اسی دوران ان کا انتقال ہو گیا اور دہلی کے ملی حلقے کی ایک نفاست پسند اور لاجواب شخصیت اپنی جگہ خالی کر کے اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔

اکتوبر 2010

OO

نزاکت علی خاں

وائس آف امریکہ واشنگٹن کی اردو سروس کے لیے کام کے دوران واشنگٹن آفس کے جن صحافیوں سے میرے پیشہ ورانہ اور دوستانہ روابط قائم ہوئے ان میں ایک انتہائی سینئر صحافی اور براڈ کاسٹر جناب نزاکت علی خان بھی رہے جن کا 30 جون 2014 کو امریکہ میں ورجینیا کے ایک اسپتال میں طویل علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ جب یہ خبر وائس آف امریکہ کی میل پر نظر آئی تو بے حد افسوس ہوا۔ اسی کے ساتھ بہت سی ایسی باتیں بھی یاد آگئیں جن کا تعلق براہ راست یا بالواسطہ طور پر نزاکت صاحب سے رہا ہے۔ ایک دوسرے سینئر صحافی، براڈ کاسٹر اور نزاکت صاحب کے دیرینہ دوست اور ہم سب کے کرم فرما جناب رضی احمد رضوی نے مرحوم کو بھرپور خراج عقیدت پیش کیا جو تین جولائی کو وائس آف امریکہ کی ویب سائٹ پر پوسٹ کیا گیا۔ یہ خراج عقیدت بے حد جذباتی اور معلوماتی ہونے کے ساتھ ساتھ بہت پرسوز بھی ہے اور اس میں مرحوم سے رفاقت کے ایک طویل عرصے کو بھی یاد کیا گیا ہے۔

اُردو سروس کے متعدد لوگوں جیسے کہ جناب رضی احمد رضوی، جناب قمر عباس جعفری، جناب اکمل علیمی، محترمہ صفیہ کاظم اور محترمہ شہناز عزیز سے روبرو ملاقات ہو چکی ہے لیکن نزاکت صاحب سے غائبانہ تعارف ہی رہا۔ لیکن یہ غائبانہ تعارف بھی کسی بالمشافہ ملاقات سے کم نہیں تھا۔ ہندوستان سے رپورٹوں کے تعلق سے واشنگٹن آفس سے جن لوگوں سے اکثر و بیشتر بذریعہ فون گفتگو ہوتی رہی ان میں نزاکت صاحب بھی تھے۔

جب بھی ان کا فون آتا تو وہ اس انداز میں گفتگو کرتے جیسے کتنے مصروف ہوں۔ رپورٹوں کے بارے میں معلومات حاصل کرتے اور اگر ضروری ہوا تو کچھ ہدایتیں اور کچھ مشورے بھی دیتے۔ 2002 میں جب ہندوستان میں کئی نامہ نگاروں کا تقرر کیا گیا تو انہی میں پٹنہ کے ایک سینئر صحافی اور عظیم آباد ایکسپریس کے سابق مدیر جناب رضوان احمد بھی شامل تھے۔ اس وقت اتر پردیش کی خبریں لکھنؤ کے ایک صحافی سے کبھی کبھار لی جاتی رہی ہیں لیکن بیشتر خبریں یا تو رضوان صاحب فائل کرتے یا راقم الحروف کو فائل کرنی پڑتیں۔ لیکن پتہ نہیں کیا ہوا کہ جس روز نزاکت صاحب ایڈیٹر انچارج ہوتے رضوان صاحب کی رپورٹیں رد ہو جاتیں۔ رفتہ رفتہ نزاکت صاحب ان سے ''الرجک'' ہوتے گئے اور اتر پردیش کی رپورٹیں وہ مجھ سے لینے لگے۔ دراصل وہ ایک حقیقی صحافی تھے۔ وائس آف امریکہ میں وہ کئی دہائیاں گزار چکے تھے۔ وہ ریڈیو کے مزاج داں تھے۔ ریڈیو کے لیے رپورٹیں اور خبریں کس مزاج کی ہونی چاہئیں اور کیسے لکھی جانی چاہئیں اس کا بھی بہت خیال رکھتے تھے۔ بہت دنوں کے بعد انھوں نے کہا کہ رضوان صاحب خبر نہیں لکھتے اداریہ لکھتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان سے رپورٹ لینے سے کتراتے رہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ رضوان صاحب بذریعہ ای میل بتاتے کہ میں فلاں رپورٹ فائل کر رہا ہوں۔ وہ ان کو منع کر دیتے اور پھر مجھے فون کر کے کہتے کہ وہ رپورٹ تم فائل کرو۔ وہ اس انداز میں کہتے کہ انکار کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

ان دنوں ریڈیو وائس آف امریکہ سے ہندوستان کی اقتصادی خبریں بھی پیش کی جاتی تھیں۔ اس کی ذمہ داری نزاکت صاحب کے سر تھی۔ انھوں نے ایک روز مجھے فون کیا اور کہا کہ ہمیں ہندوستان کی اقتصادی خبریں چاہئیں۔ یا تو تم فائل کرو یا کسی کا نام بتاؤ۔ لیکن یہ خبریں مجھے یومیہ بنیاد پر چاہئیں۔ میں نے بہت نظر دوڑائی لیکن کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیا جس کا نام میں پیش کر سکتا۔ مجھے یہ خدشہ بھی تھا کہ اگر میں نے کسی کا نام بتایا اور وہ یومیہ بنیاد پر خبریں فائل نہیں کر سکا تو نزاکت صاحب اس کا جواب مجھ سے طلب کریں گے۔ اس مشکل کو انھوں نے ہی حل کر دیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ تم کیوں

نہیں فائل کرتے۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے اس سے قبل کبھی اقتصادی خبریں نہیں بنائی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ سیاسی خبریں ہی کہاں پہلے بنائی تھیں۔ جب کام کرنے لگے تو کام آ گیا۔ چلو یہ کام تم ہی کرو اور یہ جان لو کہ دنیا کا کوئی کام مشکل نہیں ہوتا۔ تم تو ایک صحافی ہو، صحافی کو پیشۂ صحافت سے وابستہ ہر کام آنا چاہیے۔ کل سے تمھیں بزنس نیوز دینی ہے۔

مرتا کیا نہ کرتا۔ اگلے روز سے میں سیاسی رپورٹوں کے ساتھ ساتھ بزنس نیوز بھی دینے لگا۔ شروع میں کچھ عجیب سا لگا۔ لیکن پھر ایسی عادت پڑ گئی کہ بزنس نیوز پڑھے بغیر اطمینان نہیں ہوتا۔ تین چار روز کے بعد ان کا فون آیا تو میں نے ان سے پوچھا کہ میری اقتصادی خبریں کیسی جا رہی ہیں؟ انھوں نے کہا کہ بالکل ٹھیک جا رہی ہیں۔ اس کو جاری رکھو۔ ایک ڈیڑھ سال تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ میں نے ان کے اس جملے کو ہمیشہ پیش نظر رکھا کہ ''مجھے یومیہ بنیاد پر خبریں چاہئیں''۔ لہٰذا میں نے ایک روز بھی بزنس نیوز ناغہ نہیں کی۔ یہاں تک کہ اگر مجھے دہلی سے اپنے وطن جانا ہوتا تو شام کو رپورٹ فائل کر کے رات کی ٹرین سے دہلی سے نکلتا اور واپسی میں بھی ایسے ہی کرتا۔ مجھے اس کے دو فائدے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ سیاسی خبروں اور رپورٹوں کے علاوہ دوسری نوعیت کی رپورٹیں بنانے کا ڈھنگ آ گیا اور دوسرے مالی اعتبار سے مجھے کافی استحکام حاصل ہوا۔ میں اس کے لیے ہمیشہ نزاکت صاحب کا شکریہ ادا کرتا رہا اور اب بھی خود کو ان کا ممنون احسان مانتا ہوں۔ ان کا ایک وطیرہ یہ بھی تھا کہ اگر کسی رپورٹ میں کوئی غلطی ہے تو وہ فون کر کے اس کی نشاندہی کرتے اور بتاتے کہ فلاں لفظ کی جگہ پر فلاں لفظ لکھو۔ پھر وہ دوبارہ رپورٹ ریکارڈ کرواتے۔ تاہم ایسا کم ہی ہوتا۔

نزاکت علی خاں اصلاً ہندوستان کے تھے۔ ان کی پیدائش 1934 میں رامپور میں ہوئی تھی۔ وہ سولہ سال کی عمر میں پاکستان ہجرت کر گئے تھے۔ جہاں جدوجہد کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے انھوں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ وائس آف امریکہ جوائن کرنے سے قبل وہ خبر رساں ایجنسی اے پی پی میں سینئر رپورٹر کے

عہدے پر کام کر چکے تھے۔ وہ اے پی پی سے 1960 کے عشرے میں وابستہ ہوئے تھے۔ جناب رضی احمد رضوی ان کے ساتھ گزارے ایام اور واقعات کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”نزاکت علی خان نہ صرف ایک تجربہ کار صحافی تھے بلکہ انسانی رشتوں کے حوالے سے بھی ان کی ایک منفرد شخصیت تھی۔ وہ بیک وقت ایک پیشہ ور صحافی، نہایت مشفق والد اور پرخلوص دوست تھے۔ اس کا تجربہ مجھے بھی ان کی برسوں پر محیط رفاقت کے دوران ہوا جو آج بھی ہمارے ذہن پر نقش ہے اور ہمیشہ ان کی یادوں کا حصہ رہے گی۔ بات ہے 1967 کی جب میں کراچی میں پاکستان ٹیلی ویژن کا حصہ بنا۔ کراچی ٹیلی ویژن نے انہی دنوں بعد میں اپنی نشریات کا باقاعدہ آغاز کیا۔ مجھے پاکستان ٹیلی ویژن کے ذیلی ادارے ایشین ٹیلی ویژن میں رپورٹنگ کی ذمہ داری سونپی گئی۔ اس میدان میں نسبتاً ایک نوجوان اور نووارد کی حیثیت سے میری ملاقات صحافت کے شعبے کے بہت سے پرانے اور نئے لوگوں سے ہوئی۔ ان میں نزاکت علی خان بھی شامل تھے جو اے پی پی میں پہلے ہی سے ایک سینئر رپورٹر کے طور پر اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ پھر رفاقت کا یہ سلسلہ ایک مستقل صورت اختیار کر گیا اور یہ ملاقات دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ اکثر سرکاری ذمہ داریوں کی ادائیگی کرتے ہوئے ان سے کراچی ایئرپورٹ اور دوسرے مقامات پر رابطہ رہا اور ہم مختلف واقعات سے متعلق معلومات کا تبادلہ کرتے رہے۔ اس حوالے سے اکثر ان سے مفید ”ٹپس“ بھی ملتیں اور رہنمائی بھی“۔

نزاکت صاحب ایک منجھے ہوئے صحافی اور رپورٹر تھے۔ وہ برعکس حالات میں بھی اپنی ذمہ داری سے منہ نہیں موڑتے۔ محنت سے جی نہیں چراتے اور بقول رضی احمد رضوی ان کا رپورٹنگ کا انداز بڑا برملا ہوتا اور وہ بڑی تیزی کے ساتھ کوئی بھی وقت ضائع کیے بغیر اہم معلومات اپنی ایجنسی کے ذریعے ترسیل کر دیتے۔ اس تعلق سے وہ ایک اہم واقعے کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں:

”ایسا ہی ایک موقع کراچی ایئرپورٹ پر اس وقت درپیش تھا جب پولینڈ کے صدر راپسی چالسکی پاکستان کا دورہ کر رہے تھے۔ یہ دور تھا جنرل یحییٰ خان کا۔ ہوائی اڈے

پر ان کی آمد کی کوریج کے لیے ہم بھی موجود تھے۔ بدقسمتی دیکھیے کہ طیارے کی آمد کے بعد جب پولینڈ کے صدر خیر مقدم کرنے والوں سے ہاتھ ملا رہے تھے اسی وقت ایک جنونی ڈرائیور طیارے کی پشت سے تیزی سے نمودار ہوا اور اپنے کیٹرنگ ٹرک سے استقبالیہ قطار کو کچلتا ہوا نکل گیا۔ پولینڈ کے صدر تو محفوظ رہے لیکن ان کے وزیر خارجہ ولیناک ہلاک ہوگئے۔ اس کے علاوہ تین پاکستانی بھی جن میں دو فوٹوگرافر اور ایک سرکاری اہلکار شامل تھا زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے موقع پر ہی دم توڑ گئے۔ ان میں اے پی پی کے فوٹوگرافر یاسین بھی شامل تھے جو نزاکت صاحب کے ساتھ اس استقبالیہ تقریب کی کوریج کے لیے وہاں موجود تھے۔ ایک افراتفری مچ گئی اور صوبائی گورنر جنرل رحمان گل سمیت اعلیٰ عہدیدار، پولیس اہلکار اور صحافی ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اس صورت حال میں، نزاکت علی خان، گو جذبات سے مغلوب، لحہ بہ لحہ ائرپورٹ سے اے پی پی کو تازہ اطلاعات فراہم کرتے رہے۔ جذباتی لمحات اور افراتفری کے ماحول میں ان کی پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی کا یہ منظر مجھے اب بھی یاد ہے جب وہ ایرپورٹ ٹارمک سے بھاگ بھاگ کر وی آئی پی لاؤنج میں جاتے اور وہاں سے فون پر اپنی ایجنسی کو اپ ڈیٹس فراہم کرتے جو ان کے ادارے کی جانب سے متواتر پرنٹر پر اخبار کے دفاتر میں پہنچتی رہیں۔ ایک شدید چیلنج کے پس منظر میں نزاکت علی خان نے رپورٹنگ کا جو قابل تقلید نقش چھوڑا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ یہ تو محض ایک منفرد واقعہ تھا۔ متعدد موقعوں پر نزاکت صاحب نے ایک رپورٹر کے طور پر اپنی صلاحیتوں کو منوایا اور کراچی شہر میں شدید مسابقت کے ماحول میں، پیشہ ورانہ چابکدستی کا اپنے ہم پیشہ افراد کو گرویدہ بنالیا"۔

وہ اے پی پی کے چیف رپورٹر اور اقتصادی امور سے متعلق ایک نامہ نگار کے طور پر طویل عرصے تک خدمات انجام دیتے رہے۔ اس حیثیت میں انھوں نے متعدد بیرونی ملکوں کا بھی دورہ کیا اور حالات و واقعات کی رپورٹنگ کرتے رہے۔ تاہم شومیٔ قسمت کہ بعض ناخوشگوار دفتری حالات نے انھیں اے پی پی میں اپنے شاندار کریئر کو خیر باد کہنے پر مجبور کردیا اور وہ واشنگٹن میں وائس آف امریکہ سے وابستہ ہوگئے۔ یہ

1970 کی دہائی کے آخری حصے کی بات ہے۔ مختلف نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے وہ پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وائس آف امریکہ سے اپنی برسوں کی وابستگی کے دوران انھوں نے جس دیانتداری، لگن اور پیشہ ورانہ مہارت سے خدمات انجام دیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

جولائی 2014

OO

انوار احمد خان

اس ہفتے اردو دنیا کی دو اہم شخصیات ہم سے جدا ہو گئیں۔ جمعرات 6رفروری 2020 کی صبح کو انوار احمد خان کا اور سہ پہر کو قاری محمد میاں مظہری کا انتقال ہو گیا۔ جب انوار احمد خان کے انتقال کی خبر سینئر صحافی معصوم مرادآبادی کے فیس بک پوسٹ سے ملی تو دل و دماغ کو دھچکہ نہیں لگا البتہ افسوس ضرور ہوا۔ کینسر کے مریض کے سلسلے میں عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ اس کے بارے میں کوئی بری خبر کبھی بھی آ سکتی ہے۔ چونکہ میں اس بات سے واقف تھا کہ انھیں پروسٹیٹ کا کینسر ہے اس لیے ان کے انتقال پر ملال کی خبر سننے کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار تھا۔ ان سے میری شناسائی کی مدت کم و بیش پچیس برسوں پر مشتمل ہے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو میں پروگرام ایگزیکٹو کے منصب سے ترقی کرتے کرتے ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے تک پہنچے تھے۔ اسی عہدے پر رہتے ہوئے سبکدوش ہوئے۔ وہ اورنگ آباد، گورکھپور، سری نگر، لکھنؤ، بھوپال اور نئی دہلی کے ریڈیو اسٹیشنوں سے وابستہ رہے۔ نئی دہلی میں وہ پہلے ایکسٹرنل سروس ڈویژن (بیرونی نشریات) سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد وہ اسٹیشن ڈائرکٹر کے منصب پر فائز ہو کر بھوپال ریڈیو اسٹیشن چلے گئے۔ اس سے قبل وہ کچھ دنوں تک آل انڈیا ریڈیو کے نیشنل چینل سے بھی منسلک رہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب نیشنل چینل نئی دہلی کے نہرو اسٹیڈیم میں ہوا کرتا تھا۔ بعد میں وہ ٹوڈہ پور چلا گیا اور اب تو اسے بند کر دیا گیا ہے۔

میں نے آل انڈیا ریڈیو میں جن اہم شخصیات کے زیر نگرانی کیجوئل رائٹر کے طور پر کام کیا ان میں انوار احمد خان کے علاوہ مسعود ہاشمی اور معین اعجاز قابل ذکر ہیں۔ ان

لوگوں کے علاوہ اردو مجلس میں رئیس صدیقی کے ساتھ بھی کام کرنے کا موقع ملا۔ معین اعجاز تو سبکدوشی کے بعد اب بھی آل انڈیا ریڈیو کی بیرونی نشریات کی اردو سروس میں خدمات انجام دے رہے ہیں اور ان کے حکم پر خاکسار اب بھی موقع بموقع حالات حاضرہ پر تبصرہ لکھتا رہتا ہے۔ اردو سروس ہی میں معروف شاعر نعمان شوق بھی پروگرام ایگزیکٹو کی حیثیت سے برسرکار ہیں۔ معین اعجاز ایک معروف طنز و مزاح نگار ہیں۔ وہ جہاں اپنے فن میں (ریڈیو کے حوالے سے) درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے ہیں وہیں وہ ایک بہت اچھے فلمکار، اسکرپٹ رائٹر اور انسان بھی ہیں۔ مسعود ہاشمی نے لغت نویسی پر پی ایچ ڈی کی تھی اور انھیں بھی اسکرپٹ رائٹنگ میں کمال حاصل تھا۔ کسی بھی لفظ کا معنی انگریزی سے اردو یا اردو سے انگریزی میں پوچھیے تو وہ یوں برجستہ جواب دیتے کہ جیسے وہ لفظ ان کی نوک زبان پر تھا اور سوال پوچھنے کا منتظر تھا۔ (میں نے ان کے بارے میں ماضی کا صیغہ اس لیے استعمال کیا ہے کہ وہ سبکدوشی کے بعد گوشہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں)۔ معروف صحافی و شاعر اشہر ہاشمی نے 1996 یا 1997 میں جس وقت مجھے آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں پہنچایا تھا، وہاں ایک سے ایک باکمال شخصیات موجود تھیں جن میں محمود ہاشمی اور موج رامپوری بھی شامل تھے۔

آل انڈیا ریڈیو میں بہت سے لوگوں سے شرف ملاقات حاصل ہوا یا ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا لیکن جو انسانیت نوازی انوار احمد خان میں نظر آئی وہ میں نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔ آل انڈیا ریڈیو کے ایک سبکدوش افسر سنہا صاحب کے بقول ''انوار احمد بہت بڑے انسان تھے''۔ کسی بھی قسم کا تعصب انھیں چھو کے بھی نہیں گزرا تھا۔ وہ تمام انسانوں اور تمام مذاہب کا بے انتہا احترام کرتے تھے۔ مجھ پر ان کی خوبیاں اس وقت منکشف ہوئیں جب وہ اردو سروس کے پروگرام ایگزیکٹو بنائے گئے اور ان کی رہنمائی میں مجھے کام کرنے کا موقع ملا۔ اس سے قبل جب وہ نیشنل چینل میں اردو شعبے کے انچارج تھے تو وہ وہاں بھی مجھے اسکرپٹ رائٹنگ کے لیے بلاتے تھے۔ جب پہلے پہل انھوں نے مجھے بلایا اور بظاہر بڑی تمکنت کے ساتھ کہا کہ دیکھیے جناب یہ اردو سروس نہیں

ہے، یہاں ذرا انداز بدل کر کام کرنا پڑے گا، تو مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ شاید وہ اپنے منصب کا رعب مجھ پر ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن جب کام سے ہٹ کر گفتگو کرنے کا موقع ملا تو ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا جس سے یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ اس سے قبل انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہ اپنے پیشے کے تئیں ایمانداری تھی جو ان کے لہجے میں شامل ہوگئی تھی۔

لیکن جب انھیں اردو سروس کا انچارج بنایا گیا تو ان کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا موقع ملا۔ تاہم اردو سروس میں جن موضوعات پر اور جس انداز میں حالات حاضرہ پر تبصرہ لکھا جاتا ہے جس کا نام ''آج کی بات'' ہے، اس سلسلے میں وہ اپنے پیش روؤں جیسے کہ معین اعجاز اور مسعود ہاشمی کے ہم پلہ نہیں تھے۔ ان کو موضوعات کی تلاش میں دشواری ہوتی اور تبصرہ نگار کو جس انداز میں بریفنگ کی جاتی ہے اس میں بھی ان کی ناپختگی جھلکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اول الذکر دونوں شخصیات جہاں محض ایک جملے کی خبر پر پورا تبصرہ لکھ دیتی ہیں یا دوسروں سے لکھوا لیتی ہیں، اس کے لیے انوار احمد خان پورا پلندہ ہاتھ میں لیے رہتے تھے۔ وہ ہم لوگوں کو دسیوں صفحات کا مضمون تھما کر دو چار جملے بریف کرتے اور پھر یہ مشورہ دیتے کہ اپنے انداز میں بنا لیجیے۔ لیکن یہ سب کچھ وہ اتنے شریفانہ انداز میں اور مسکراتے ہوئے کرتے کہ گراں نہیں گزرتا۔ میرا خیال ہے کہ وہ تحریر سے زیادہ ایڈمنسٹریشن کے آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مضمون نویسی سے دور رہا کرتے تھے۔ میں نے ان کے اکا دکا مضامین ہی اخباروں میں دیکھے ہیں۔ لیکن ان کے اندر دوسری بہت سی خوبیاں تھیں۔ میں نے انھیں غصہ ہوتے بہت کم دیکھا۔ ہنس کر بات کرتے اور قہقہہ بردوش کرتے۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ دوسروں کو چھیڑتے تھے۔ لیکن اس میں کسی تعصب یا خود کے بڑا ہونے کے خیال کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ بس مزا لینے کے لیے چھیڑ چھاڑ کیا کرتے تھے۔ فارسی سیکشن سے وابستہ احمد علی برقی اعظمی سے خوب لطف لیتے۔ ایک بار برقی اعظمی اور ہم ان کے کمرے میں پہنچے تو انھوں نے ہنس کر کہا کہ آیئے استاذ الاساتذہ آیئے۔ پھر مجھ سے کہنے لگے کہ اگر علی بھائی تھوڑا قلم روک کر

شاعری کریں اور ہمیشہ فی البدیہہ نہ کہیں تو بہت اچھے شاعر ہو سکتے ہیں۔ برقی اعظمی کچھ شرمائے، کچھ جھجکے مگر انھوں نے اف تک نہیں کی۔ حالانکہ انوار احمد نے جس انداز میں یہ بات کہی تھی کوئی اور ہوتا تو وہ ناراض ہو جاتا۔ بہر حال ہم دونوں ان کے کمرے سے نکل آئے۔ اگلی ملاقات میں انھوں نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ برقی اعظمی کی صلاحیتوں اور ان کی انسانی خوبیوں کی تعریف کی اور مجھ سے کہا بھائی سہیل انجم میں دل سے ان کی قدر کرتا ہوں۔ وہ سب کو عام طور پر بھائی کہہ کر ہی پکارتے تھے۔

کچھ دنوں قبل لکھنؤ کے ہمارے دوست اویس سنبھلی نے ریڈیو کے ایک پرانے براڈ کاسٹر جناب شفاعت علی صدیقی پر ایک سیمینار کرنے کا پروگرام بنایا اور مجھ سے کہا کہ آپ بھی ریڈیو سے وابستہ ہیں اور شفاعت صاحب نے بھی پوری زندگی ریڈیو میں گزاری تھی تو آپ کو کلیدی خطبہ پیش کرنا ہے۔ میں نے معذرت چاہی کہ میں ان سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ لیکن وہ نہیں مانے۔ بالآخر میں نے اردو سروس سے وابستہ رہے ڈاکٹر شکیل اختر سے مشورہ کی بنیاد پر انوار صاحب کو فون کیا اور شفاعت صاحب کے بارے میں معلومات چاہیں۔ انھوں نے صاحب فراش ہونے کے باوجود خوش دلی کے ساتھ دو نشستوں میں ان کے بارے میں اتنا کچھ بتا دیا کہ میرا مقالہ تیار ہو گیا۔ کسی مجبوری کی وجہ سے میں وہاں حاضر نہیں ہو سکا لیکن مقالہ پڑھا گیا اور سراہا گیا۔ سبکدوشی سے کچھ پہلے وہ مجھ سے اکثر کہتے کہ بھائی سہیل انجم ریٹائرمنٹ، کے بعد میں کچھ اور کروں گا۔ آپ کو بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔ میں آپ کو چھوڑوں گا نہیں۔ (ان کا اشارہ لکھنے پڑھنے کی طرف تھا)۔ میں ان سے کہتا انوار بھائی آپ جہاں کہیں گے میں حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ان کو پروسٹیٹ کا کینسر ہے۔ شاید اسی لیے انھوں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں کوئی غور نہیں کیا۔ بہر حال اب وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ان کی صرف یادیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگزر کرے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

فروری 2020

نعمان فاروقی

پچیس ستمبر 2018 کی صبح کو جب یہ اطلاع ملی کہ نعمان فاروقی اب اس دنیا میں نہیں رہے تو دل و دماغ کو شدید دھچکہ لگا۔ دل کہہ رہا تھا کہ یہ خبر غلط ہوگی۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ ابھی تو چند روز قبل ان کے دولت خانے پر ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر دماغ کا کہنا تھا کہ کیوں نہیں ہوسکتا؟ جانے کتنے لوگ یوں ہی اچانک اور چپکے سے رخت سفر باندھ لیتے ہیں اور جب وہ ایک ایسی دنیا میں چلے جاتے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا تب لوگوں کو علم ہوتا ہے اور پھر یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔ سو یقین کرنا ہی پڑا کہ اب نعمان فاروقی جیسی شریف، مرنجاں مرنج، بذلہ سنج اور پُر بہار شخصیت کی صحبت سے لطف اندوز ہونے کے دن چلے گئے۔ ان کو وائرل ہوگیا تھا جس کا علاج چل رہا تھا۔ مگر وائرل تو ایسا کوئی موذی مرض نہیں کہ آدمی روٹھ جائے اور کاروبارِ دنیا سے منہ موڑ لے۔ لیکن وہ روٹھ گئے۔ 25 ستمبر کو صبح کے تقریباً تین ساڑھے تین بجے دل کا دورہ پڑا۔ انھیں ہولی فیملی اسپتال نئی دہلی لے جایا گیا۔ لیکن انھوں نے اعزا و اقربا اور دوست احباب کو کسی انجانی خلش میں مبتلا رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔ انھوں نے اسپتال میں زیادہ دیر ٹھہرنے سے بھی انکار کردیا۔ مگر گھر کا راستہ پکڑنے کے بجائے دوسری دنیا کی راہ تھام لی۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ نعمان فاروقی کون ہیں؟ آپ کا سوچنا بجا ہے۔ وہ مشہور نہیں گمنام آدمی تھے۔ ان کو اپنی شہرت سے بھی کوئی غرض نہیں تھی۔ ان کو تو صرف اپنے کام سے دلچسپی تھی سو وہ اسی میں منہمک رہتے۔ آبائی وطن شاہجہاں پور تھا مگر

دہلی ان کی کرم بھومی تھی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ دہلی میں اردو کتابوں کے ایک بڑے پبلشر تھے۔ ''نیو پرنٹ سینٹر'' کے نام سے کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی میں ان کا دفتر تھا۔ ان کی عمر ساٹھ سال تھی۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی اردو کتابوں کی پرنٹنگ و اشاعت کے لیے وقف کر دی تھی۔ وہیں ان کا اپنا پریس بھی تھا بلکہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک کلر پرنٹنگ مشین میں بھی ان کا شیئر تھا۔ جس کی وجہ سے کتابوں کی چھپائی بہت اچھی ہوتی تھی اور دوسرے یہ کہ لاگت کم آتی تھی۔ معیار انتہائی اعلیٰ اور بائنڈنگ انتہائی مضبوط اور دیرپا۔ چونکہ ان کا اپنا بائنڈنگ کا کارخانہ بھی تھا جواب بھی ہے، اس لیے وہ کسی دوسرے پر انحصار کے بجائے اپنے سامنے بائنڈنگ کرواتے اور اگر کسی کسٹمر نے شکایت کر دی کہ بائنڈنگ خراب ہے تو وہ اس کو ادھڑوا دیتے تھے اور پھر سے کسٹمر کی پسند کے مطابق بائنڈنگ کرواتے خواہ اس میں انھیں نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑ جائے۔

وہ کم و بیش دس برسوں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی کتابیں چھاپتے رہے ہیں۔ نہ صرف ادبی کتابیں بلکہ درسی اور فاصلاتی تعلیم کے کورس کی کتابیں بھی۔ مکتبہ جامعہ کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر خالد محمود نے جب اس وقت کے وائس چانسلر نجیب جنگ کو غالب پڑھانا شروع کیا تو ان کے پی اے ظفر نواز ہاشمی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ظفر نواز ہاشمی نعمان فاروقی کے ہم زلف ہیں۔ انھوں نے نعمان فاروقی کا سامنا پروفیسر خالد محمود سے کرا دیا۔ خالد صاحب بڑے ذہین اور مردم شناس ہیں۔ جب ان کو نعمان فاروقی کے مشغلے کا علم ہوا تو انھوں نے بطور تجربہ ان کو ایک کام دیا۔ پھر کیا تھا۔ نعمان فاروقی نے ان کو یا انھوں نے فاروقی کو ایسا پکڑا کہ دونوں آخر تک ایک دوسرے سے علیحدہ نہیں ہوئے۔ دراصل ان کا کام معیاری تو ہوتا ہی تھا ان کا کردار بھی بڑا اعلیٰ تھا۔ شرافت و نفاست ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وضعداری ایسی کہ برسوں بیت جائیں، کسی سے بقایا جات کی ادائیگی کا تقاضا نہیں کرتے تھے۔ لہٰذا پروفیسر خالد محمود نے مکتبہ جامعہ کے دروازے ان کے لیے چوپٹ کھول دیے۔ وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ ان سے اپنی ذاتی کتابیں بھی چھپوانے لگے۔ ان کی تازہ ترین کتاب ''تفہیم و تعبیر''

انھی کی طبع کردہ ہے۔ کتاب دیکھتے ہی ہر کوئی اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔

مکتبہ جامعہ سے تعلق قائم ہونے کے بعد سے ہی ان کا معمول بن گیا تھا کہ صبح دس ساڑھے دس بجے سر سید روڈ، جوگا بائی، نئی دہلی پر واقع اپنی رہائش گاہ سے چلتے تو مکتبہ جامعہ پر پڑاؤ ڈالتے۔ وہاں کے اسٹاف سے ملتے۔ کچھ معاملات ہوتے تو وہ نمٹاتے اور اگر مکتبہ کا کچھ چھپائی وغیرہ کا کام ہوتا تو وہ لیتے اور پھر آٹو رکشہ پکڑ کر دریا گنج چلے جاتے۔ وہاں دن بھر کام کرتے اور رات میں آٹھ نو بجے پھر بذریعہ آٹو گھر لوٹ آتے۔ واپسی کے لیے ان کا آٹو ڈرائیور مقرر تھا۔ وہ ان کے لیے اپنا وقت فاضل رکھتا اور انھیں سر سید روڈ چھوڑتا ہوا اپنے گھر چلا جاتا۔

اپنی کتابیں اچھی اور سستی چھپوانے والے اردو مصنفوں کے لیے نعمان فاروقی کسی فرشتے سے کم نہیں تھے۔ وہ جہاں مکتبہ جامعہ کی کتابیں چھاپ رہے تھے وہیں دہلی ہی میں کئی پبلشروں کی کتابیں بھی چھاپتے تھے۔ اس کے علاوہ ملک کے مختلف علاقوں سے ان کے پاس مسودے آتے اور وہ بذریعہ فون معاملات طے کر کے چھاپ دیتے اور دیے گئے پتے پر بذریعہ ٹرانسپورٹ بھجوا دیتے۔ لیکن مجال کیا کہ جو بات طے ہوئی ہو اس سے انحراف کریں۔ جو کاغذ طے ہوتا وہی لگاتے۔ جو ڈیزائن پسند کیا جاتا وہی استعمال کرتے۔ وہ دوسرے آرٹسٹوں کے بھی محتاج نہیں تھے۔ ان کا اپنا آرٹسٹ تھا۔ وہ اس سے ایک کتاب کے کئی ٹائٹل بنواتے اور مصنف کے پاس میل کر دیتے۔ مصنف جو پسند کرتا اور جتنی بار ترمیم چاہتا وہ اس کا پاس ولحاظ رکھتے۔

بیرون دہلی سے بھی مصنفوں اور پبلشروں سے ان کے مراسم تھے جو ان کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ میرا اپنا خیال ہے کہ انھوں نے درجنوں نہیں بلکہ ہزاروں ٹائٹل چھاپے ہوں گے۔ لیکن مجال کیا کہ کسی نے شکایت کی ہو۔ جس نے ایک بار ان سے کام کرا لیا وہ ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا وہ کسی سے پیسوں کا تقاضا نہیں کرتے تھے۔ اگر بہت مجبوری آ گئی تو بڑی شرافت سے کہتے کہ ''کاغذ لینا ہے اگر کچھ انتظام ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ کوئی بات نہیں۔ میں کسی طرح کام چلا لوں

گا''۔ میں اردو کے ایسے کئی مصنفوں، شاعروں اور مدیروں کو جانتا ہوں جو برسوں سے ان کے ذریعے کتابیں چھپوا رہے ہیں اور چھپوانے کے بعد بھول جاتے ہیں کہ انھیں فاروقی صاحب کو پیسے بھی دینے ہیں۔ فاروقی صاحب بھی ایسا لگتا کہ جیسے بھول گئے ہوں۔

مشرقی اتر پردیش کے سدھارتھ نگر ضلع کے ایک مولانا صاحب بیسیوں برس سے ان سے اپنی کتابیں چھپوا رہے تھے۔ لیکن دونوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ صرف فون پر بات ہوتی۔ مسودہ آجاتا۔ وہ چھاپ دیتے اور ٹرانسپورٹ سے ان کے پتے پر بھیج دیتے۔ جب رمضان آتا تب ان کی طرف سے پیسوں کی ادائیگی ہوتی۔ نعمان فاروقی کو بھی معلوم تھا کہ رمضان تک انتظار کرنا پڑے گا۔ اس لیے وہ تقاضا بھی نہیں کرتے تھے۔ جب ان کو ہم نے نعمان فاروقی کے انتقال کی خبر دی تو انھوں نے اظہار غم کرتے ہوئے کہا کہ ''ہاں کسی نے فیس بک پر خبر ڈالی تھی میں نے وہیں دیکھی ہے۔ سہیل انجم صاحب! میں بیس پچیس برسوں سے ان سے اپنی کتابیں چھپوا تا رہا ہوں۔ لیکن نہ میں نے ان کو کبھی دیکھا نہ انھوں نے مجھے دیکھا۔ ہم دونوں کی غائبانہ ملاقاتیں تھیں۔ صرف فون پر بات ہوتی۔ انھوں نے کبھی بھی مجھ سے پیسوں کا تقاضا نہیں کیا اور میں نے بھی اپنے وقت پر ان کو پیسے دیے۔ اب میں سوچتا ہوں کہ کس کو پکڑوں جو اس طرح میرا کام کر دیا کرے۔ ایسے لوگ اب کہاں ملتے ہیں؟''

مختلف شہروں میں ایسے کئی مصنفین اور شعرا ہیں جو ان سے اپنی کتابیں چھپواتے رہے ہیں اور ان کی کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ان پر اور ان کے کام پر لوگوں کو اتنا اعتماد تھا کہ وہ بالمشافہ ملاقات کر کے معاملات طے کرنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ نعمان فاروقی بھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے کہ ملاقات ہو۔ ان کو بھی لوگوں پر اعتماد تھا۔ ایک بار میں نے پوچھا کہ آپ ایسے ہی چھاپ کر کتابیں بھیج دیتے ہیں اگر پیسے نہ آئیں تو کیا کریں گے؟ ان کا جواب تھا کہ ''مجھے ان پر اور اللہ کی ذات پر بھروسہ ہے۔ اگر کوئی میرا پیسہ مار بھی لے گا تو کتنا مارے گا اور پھر اسے قیامت کے روز تو دینا ہی پڑے گا۔ لے جائے کب تک لے جائے گا''۔

نعمان فاروقی سے میری شناسائی کم و بیش بیس پچیس برسوں پر مشتمل تھی۔ پہلے جب میں ہفت روزہ اخبار نو اور پھر روزنامہ قومی آواز میں کام کرتا تھا تو ان سے رات میں دفتر سے اوکھلا لوٹتے وقت بس میں ملاقات ہوتی تھی۔ ادھر حالیہ برسوں میں یا تو میں ان کے دولت خانے پر چلا جاتا یا اگر دریا گنج کی طرف جانا ہوا تو ان کے دفتر چلا جاتا۔ میں بھی اپنی کتابیں عموماً انہی سے چھپوایا کرتا تھا۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ ان کے پاس مختلف مسالک کے ماننے والے اپنی کتابیں چھپواتے تھے۔ دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث، شیعہ سبھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ ہر مسلک کے پیروکار کے جذبات کا خیال رکھتے تھے۔ یعنی اگر کسی کتاب میں کسی مسلک کے خلاف کوئی بات ہے تو وہ اس مسلک کے ماننے والے کسی بھی شخص کے سامنے وہ کتاب نہیں ہونے دیتے تھے۔ ہمارے ایک عزیز اور رشتے دار مولانا محمد اسماعیل دبئی میں مقیم ہیں۔ ان کی مذہبی کتابیں بھی ہم انہی سے چھپواتے۔ مگر کبھی انھوں نے پیسوں کا تقاضا نہیں کیا۔ مولانا رقم بھیج دیتے۔ میں ان کو بتا دیتا۔ اور کبھی عدم فرصت کی وجہ سے ان کو بروقت دے نہیں پاتا تو وہ یہ نہیں کہتے کہ پیسہ آگیا ہے تو اپنے پاس کیوں رکھے ہوئے ہیں، مجھے کیوں نہیں دیتے۔

ہمارے ایک صحافی دوست تحسین منور کو اپنی کتاب چھپوانی تھی۔ انھوں نے ہم سے کہا۔ ہم ان کو لے کر نعمان فاروقی کے پاس گئے۔ ان سے درخواست کی کہ یہ ہمارے دوست ہیں۔ کتاب اچھی اور سستی چھپنی چاہیے۔ انھوں نے ہماری بات کا لحاظ رکھا۔ جب کتاب چھپ کر آئی تو تحسین منور ان کے گرویدہ ہو گئے اور جو طے ہوا تھا اس سے بھی زیادہ کی ادائیگی کی۔ کئی پبلشروں کو بھی ان سے ہمارے مراسم کا علم تھا۔ دو ایک نے تو دبی زبان میں ہم سے شکایت بھی کی کہ آپ انہی سے چھپواتے ہیں ہم سے نہیں۔ کبھی ہم سے بھی چھپوا کر دیکھیے۔ اب ہم ان سے نعمان فاروقی کی کس کس خوبی کا ذکر کرتے۔

ان میں شرافت و وضعداری اتنی تھی کہ اگر جامعہ علاقے کا کوئی شخص ان سے کتاب یا رسالہ چھپواتا اور وہ وہاں جا کر لانے سے معذوری ظاہر کرتا تو وہ خود پہنچا دیتے تھے۔ میں نے ان کے گھر بارہا ایسے رسالوں کے بنڈل دیکھے ہیں جو یہاں کے لوگ

نکالتے ہیں۔ شعری مجموعے بھی اکثر و بیشتر ان کے ڈرائنگ روم میں دیکھنے کو ملتے رہے ہیں۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مجھے اپنی چھپی ہوئی کتابیں چاہئیں مگر وقت کی قلت کے سبب میں جانے سے معذوری ظاہر کرتا تو وہ کہتے کہ ''ارے آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں، میں لے آؤں گا''۔ اور واقعی وہ رات میں فون کرتے کہ میں آٹو سے آرہا ہوں، آپ کی کتابیں لا رہا ہوں۔ اگر زیادہ ہوتیں تو آٹو رکشہ گھما کر میرے دروازے سے ہو کر کتابیں دیتے ہوئے جاتے اور اگر کم ہوتیں تو سرسید روڈ پر اصلاح مسجد کے پاس بلا لیتے اور کتابیں تھماتے ہوئے نکل جاتے۔

طنز و مزاح کے معروف شاعر اسرار جامعی نے جب اپنا شعری مجموعہ ''شاعر اعظم'' چھپوایا اور نعمان فاروقی سے کہا کہ میں بوڑھا آدمی ہوں، میں کتابیں لینے آپ کے پریس کیسے آؤں؟۔ انھوں نے کہا کہ آپ مت آیئے، میں لے آؤں گا۔ اور واقعی شام کے وقت وہ ایک ہزار کتابیں لے کر ان کی رہائش گاہ پر آگئے۔ پھر تو اسرار جامعی ان کے ایسے مرید ہوئے کہ جب بھی کتابوں کی اشاعت کا ذکر چھڑتا وہ اس واقعے کا حوالہ دے کر نعمان فاروقی کی تعریف کرنا نہیں بھولتے۔

25 ستمبر کے بعد ایسے کئی افراد ملے جنھوں نے ان کے انتقال پر اظہار غم کرتے ہوئے ان سے اپنے دیرینہ رشتے کا ذکر کیا۔ کسی نے کہا کہ وہ ان سے قرآن مجید چھپواتے تھے۔ کسی نے کہا کہ وہ رجسٹر چھپواتے تھے۔ کسی نے شعری مجموعہ کا ذکر کیا تو کسی نے ادبی رسالے کا۔ سہ ماہی ''ادب سلسلہ'' وہ نووارد رسالہ تھا جو ان کے زیر دست پہنچا اور جس کی چھپائی کی ستائش ہر اس شخص نے کی جس نے اس کی ورق گردانی کی۔

نعمان فاروقی انتہائی پُر مزاح اور بذلہ سنج تھے۔ کسی کا دل دکھانا ان کی شریعت اور سرشت میں نہیں تھا۔ اپنا نقصان کر لیتے مگر دوسرے کا نقصان نہیں ہونے دیتے۔ لحیم شحیم قد تھا۔ کھانے پینے اور اس سے بھی زیادہ کھلانے پلانے کے شوقین تھے۔ پان کے عاشق تھے۔ خوبصورت چہرے، گورے اور بھرے بھرے رخسار کے ساتھ جب پان کی باریک پیک ان کے لبوں پر نمودار ہوتی تو چہرہ کھل اٹھتا۔ شوگر اور بلڈ پریشر کے مریض

تھے۔ مگر مٹھائیاں خوب کھاتے تھے۔ میں ان کے گھر جاتا تو مجھے بھی زبردستی کھلاتے۔ جب میں کہتا کہ میری شوگر بارڈر پر ہے۔ تو کہتے کہ "ارے میری تو بڑھی رہتی ہے۔ مگر کھائیے۔ یہ شوگر فری دکان سے لی گئی ہے۔ میں وہیں سے لاتا ہوں"۔ چائے پینے کے بھی خوب شوقین تھے۔ چائے کا کپ ان کے قد کے حساب سے ہی ہوتا۔ گویا حصہ بقدر جثہ والا معاملہ تھا۔

یوں تو بظاہر وہ بڑے خوش مزاج تھے مگر اندر سے بہت دکھی تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنا دکھ ظاہر نہیں کرتے تھے۔ دکھ یہ تھا کہ ان کے کوئی اولاد نرینہ نہیں۔ تین بیٹیاں ہیں اور تینوں جامعہ ملیہ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر غیر شادی شدہ ہیں۔ ان کی شادیوں کے لیے وہ بہت پریشان رہا کرتے تھے۔ اب ان کے کاروبار کا سارا بوجھ ان کی بیٹیوں کے کندھوں پر آگیا ہے۔ انھوں نے اپنے والد کے کاروبار کو سنبھالنے اور آگے بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کام میں ان کی مدد کرے۔ آمین۔

ستمبر 2018

OO

مولوی عبدالرحمٰن

میں اس وقت مکہ مکرمہ میں ہوں۔ فریضۂ حج کی ادائیگی کی غرض سے آیا ہوا ہوں۔ میں نے یکم اور دو اگست کی درمیانی شب میں ایک بجے کے بعد طواف کرنے اور حرم شریف میں نماز فجر کی ادائیگی کا پلان بنایا۔ مقامی وقت کے مطابق شب کے پونے دو بجے ہم طواف سے فارغ ہوئے اور وہاٹس ایپ چیک کرنے لگے تو مدیر نوائے اسلام جناب مولانا عزیز عمر سلفی صاحب کا میسیج بارہ بج کر 38 منٹ پر آیا ہوا تھا جس میں مولوی عبدالرحمٰن کے انتقال کی خبر تھی۔ کوئی دھچکہ نہیں لگا۔ افسوس ضرور ہوا۔ دھچکہ تو اس وقت لگا تھا جب شاہین باغ کے مولانا تجمل حسین صاحب نے ان کو کینسر کا عارضہ لاحق ہونے کی افسوسناک خبر دی تھی۔ میں نے فوراً کعبہ کے سامنے مطاف میں بیٹھ کر ان کی مغفرت کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ ان کی لغزشوں سے درگزر کرے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

تقریباً ڈیڑھ ماہ قبل ایک شام عزیز عمر سلفی صاحب نے فون کر کے پوچھا کہ کیا عبدالرحمٰن کے بارے میں خبر ہے۔ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ کہنے لگے کہ دیکھنے گئے تھے۔ میرا جواب نفی میں تھا۔ البتہ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ جلد ہی جانے والا ہوں۔ بہت حسرت بھرے انداز میں کہنے لگے کہ جایئے دیکھ آیئے۔ یہ نہیں کہا کہ مل آیئے بلکہ یہ کہا کہ دیکھ آیئے۔ ان کے اس جملے سے مجھے حالات کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا۔ جملے کے بین السطور میں مستقبل کا عکس نظر آرہا تھا۔ میں فوراً شاہین باغ کے لیے روانہ ہو گیا۔

انھوں نے پتہ سمجھا دیا تھا۔ نماز مغرب شاہین باغ کی طیب مسجد میں ادا کی اور وہیں پڑوس میں ان کو دیکھنے گیا۔ تاریک زینوں سے گزرتے وقت ایک انہونی کا احساس ہوا۔ جب اوپر ان کے کمرے میں پہنچا اور ان کو دیکھا تو انہونی کے احساس کی شدت بڑھ گئی۔ جسم اور چارپائی دو نہیں ایک نظر آرہے تھے۔ ان کے گھر کی بے ترتیبی بھی بہت کچھ بیان کر رہی تھی۔ میرے سلام کا انھوں نے اسی روایتی خندہ پیشانی سے جواب دیا جو ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ میں ان کی چارپائی پر سائڈ میں بیٹھ گیا۔ تقریباً پون گھنٹے کی اس ملاقات میں ڈھیر ساری باتیں ہوئیں۔ ان کا انداز امیدوں اور آرزوؤں سے پُر تھا۔ کہنے لگے کہ بس ایمس سے ایک رپورٹ آنے والی ہے اس کے بعد اصل علاج شروع ہوگا اور میں جلد ہی شفایاب ہو جاؤں گا۔ لیکن نہ تو میرے اندر یہ ہمت تھی کہ میں ان کو صورت حال کی سنگینی بتاتا اور نہ ہی کسی دوسرے میں تھی۔ میں بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ حالانکہ میں سن چکا تھا کہ ایمس کے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ میں نکلنے ہی والا تھا کہ پانچ سات علماء کا ایک گروپ پہنچ گیا۔ میں زینے سے اتر رہا تھا تو دو تین اور ملے۔ نیچے گلی میں آیا تو دو افراد موٹر سائیکل سے جا رہے تھے۔ کہنے لگے کہ عبد الرحمٰن صاحب کو دیکھنے جا رہے ہیں۔ یہ یقین پختہ تر ہو گیا کہ یہ مریض غم کی عیادت نہیں ہے بلکہ ایک ایسے شخص کی عیادت ہے جو جلد ہی حقیقت سے عدم، حال سے ماضی اور لمحۂ موجود سے تاریخ بننے جا رہا ہے۔ میں شدت غم سے چور اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ رات میں بار بار ان کا خیال آتا رہا۔ کئی روز تک طبیعت پر پژمردگی چھائی رہی۔

عبد الرحمٰن سے کب ملاقات ہوئی تھی یہ تو یاد نہیں البتہ بہت سی باتیں پردۂ ذہن پر ضرور نمودار ہو گئیں۔ ان میں کئی خوبیاں تھیں۔ انتہائی خوش اخلاق اور معاون تھے۔ کوئی بھی کام ہو حاضر۔ کسی کام کے سلسلے میں انکار نہیں۔ ہر فیلڈ کا کام کرنے کی صلاحیت۔ زبردست خود اعتمادی۔ مگر ضرورت سے زیادہ نہیں۔ یعنی ان کے اندر Confidence تو تھا لیکن وہ Over Confident نہیں تھے۔ مدارس کے طلبہ کی اسناد کا معاملہ ہو یا کسی کے اخبار یا رسالے کے رجسٹریشن، این آر آئی نمبر، ڈی ایل نمبر یا اشتہاروں کا معاملہ ہو۔

کسی کا ریلوے کا ٹکٹ ہو یا ہوائی جہاز کا۔ کسی کو اندرون ملک سفر کرنا ہو یا بیرون ملک۔ ویزا دلوانا ہو یا کوئی ڈگری و سرٹیفکیٹ۔ کسی کو اسپتال میں داخل کروانا ہو یا نکلوانا ہو۔ گویا کہ کوئی بھی کام ایسا نہیں جو وہ نہ کر سکتے ہوں یا جس کے بارے میں انھوں نے معذرت کر لی ہو۔ ان کے دوستوں اور شناساؤں کا حلقہ بہت بڑا تھا۔ ہر شخص ان کی خوبیوں کی وجہ سے ان سے محبت کرتا تھا۔

ہفت روزہ اخبار نو کے مینجنگ ایڈیٹر اور سابق ایم پی وسفیر جناب م افضل کے سکریٹری 80 سالہ جناب مودود صدیقی کو جب ہم نے عبد الرحمٰن کو کینسر ہونے کی بری خبر سنائی تو وہ پریشان ہو گئے۔ کچھ دیر تک ان پر سکتے کا عالم طاری رہا اور پھر کہنے لگے کہ میرے کئی شناساؤں کو کینسر ہوا مگر جتنی تکلیف مجھے عبد الرحمٰن کاتب کے بارے میں سن کر ہوئی کسی کے بارے میں نہیں ہوئی۔ وہ انھیں عبد الرحمٰن کاتب کہا کرتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے ان کے بھائی کا موبائل نمبر لیا۔ وہ ملاقات کے لیے بے چین تھے۔ مگر جس دن وہ جانا چاہتے تھے اس سے پہلے ہی انھیں کسی اسپتال میں بھرتی کرایا گیا تھا۔ ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اس خبر سے صدمے میں مبتلا ہیں۔

ان کے اندر جو خود اعتمادی تھی اس کی ایک مثال ملاحظہ کریں۔ کئی سال قبل عید کے موقع پر ہم بچوں کے ساتھ گھر جا رہے تھے۔ ویشالی میں تھری ٹائر میں ہمارا ٹکٹ تھا۔ پوری ٹرین میں لاتعداد ہم علاقہ موجود تھے۔ عبد الرحمٰن بھی نظر آ گئے۔ میں نے پوچھا تو کہنے لگے کہ ہاں جلدی میں پروگرام بن گیا گھر جا رہا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ کس ڈبے میں ہیں۔ کہنے لگے کہ ٹکٹ لینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ لیکن ہمارا کیا ہے ہم تو بغیر ٹکٹ بھی اے سی میں چلے جائیں گے۔ میری سب سے چھوٹی بیٹی کم عمر تھی۔ میں نے اس کو دوسری بیٹی کی برتھ پر لٹا دیا اور ایک برتھ ان کو دے دی۔ اور واقعی بے ٹکٹ ہوتے ہوئے بھی وہ بڑی خود اعتمادی کے ساتھ اے سی میں دہلی سے بستی تک چلے گئے۔

جامعہ اسلامیہ دریاباد اتر پردیش کے مولانا جعفر مدنی صاحب نے کہا کہ ماہنامہ استدراک کے آر این آئی اور ڈی ایل نمبر کا مسئلہ ہے اس کو کرا دیجیے۔ میں نے کہا

کہ دہلی آجایئے۔ وہ آگئے مگر جس سے ہم کام کرانا چاہتے تھے وہ اپنے وطن بہار گئے ہوئے تھے۔ پھر جعفر صاحب نے عبدالرحمٰن سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے ان کو ساتھ لیا اور آر این آئی کے دفتر پہنچ گئے۔ اتفاق سے وہاں کام کرنے والا ایک کارکن ان کا شناسا نکلا۔ بہر حال وہ کام ہو گیا۔ اس طرح بہت سے لوگوں کے انھوں نے کام کرائے۔ کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔ باتیں بہت ہیں۔ ہاں اب تو صرف باتیں ہی رہ گئی ہیں۔ وہ شخص جو علامہ حالی کے اس شعر پر پوری زندگی عمل پیرا رہا کہ: یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں، کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں، وہ اب اس دنیا سے چلا گیا۔ اللہ اس مرد آزاد کے گناہوں کو معاف کرے اور اس کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

اگست 2018

OO

سہیل انجم کی دیگر مطبوعہ کتابیں

۱۔ میڈیا روپ اور بہروپ (چار ایڈیشن)
۲۔ میڈیا روپ اور بہروپ (ہندی)
۳۔ میڈیا اُردو اور جدید رجحانات
۴۔ مغربی میڈیا اور اسلام
۵۔ احوال صحافت
۶۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط: حیات و خدمات
۷۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط کے منتخب اداریے
۸۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری: حیات و خدمات (یادگار مجلّہ)
۹۔ دہلی کے ممتاز صحافی
۱۰۔ اردو صحافت اور علماء
۱۱۔ دینی رسائل کی صحافتی خدمات (دو ایڈیشن)
۱۲۔ انجم تاباں (مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم کی علمی خدمات کا مطالعہ)
۱۳۔ محفوظ الرحمٰن: اردو صحافت کا نشان امتیاز
۱۴۔ موہن چراغی اور قومی آواز
۱۵۔ باتیں اخبار نویسوں کی
۱۶۔ نقش بر آب (شخصی خاکوں کا مجموعہ)
۱۷۔ پھر سُوئے حرم لے چل (سفرنامہ حج)
۱۸۔ باز دید حرم (سفرنامہ حج دوم)

۱۹۔ لبراہن رپورٹ اور بابری مسجد
۲۰۔ بازیافت (ادبی وتنقیدی مضامین کا مجموعہ)
۲۱۔ عکس مطالعہ (ادبی وصحافتی مضامین)
۲۲۔ مطالعات (۹۹ کتابوں پر تبصرے)
۲۳۔ فرقہ وارانہ جنون (ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا تحقیقی جائزہ)
۲۴۔ فاروق انصار کے افسانے
۲۵۔ حنیف ترین: فن اور شخصیت (ماہنامہ کتاب نما کا خصوصی شمارہ)

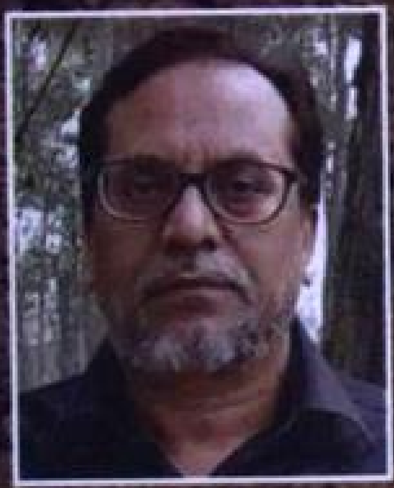
منتظر اشاعت

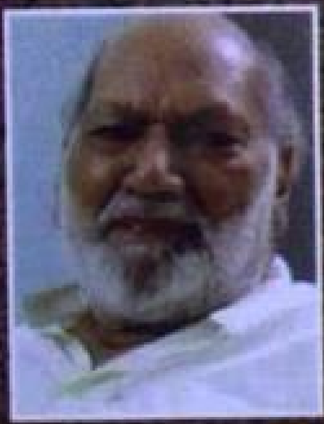
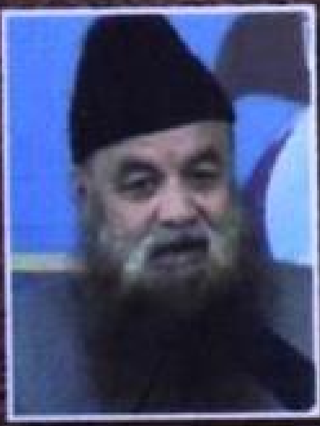
☆ مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم اہلِ علم ودانش کی نظر میں
☆ مقالات انجم (مولانا ڈاکٹر حامد الانصاری انجم کے منتخب مضامین)
☆ اُردو زبان: مقبول بھی مظلوم بھی
☆ سہیل انجم کے تبصرے

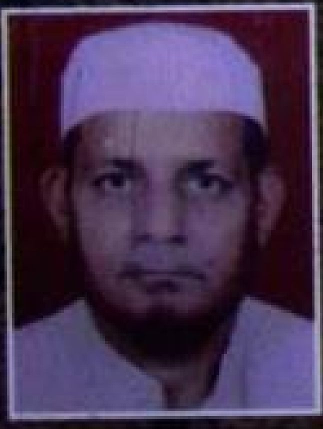
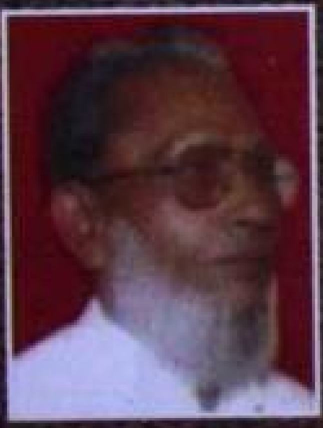
OO

NAQSH BAR SANG

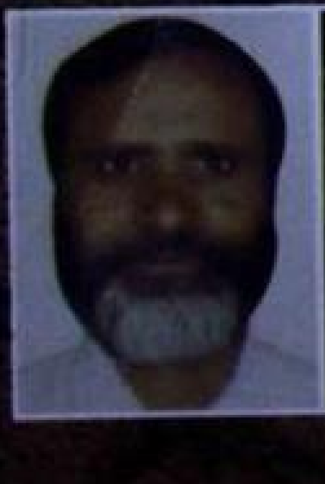
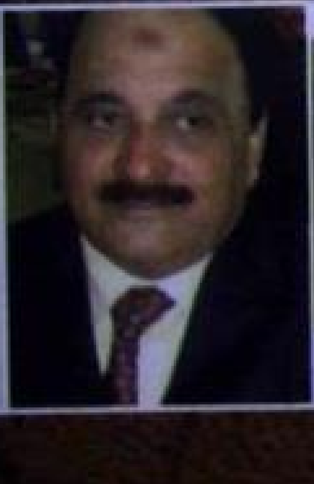
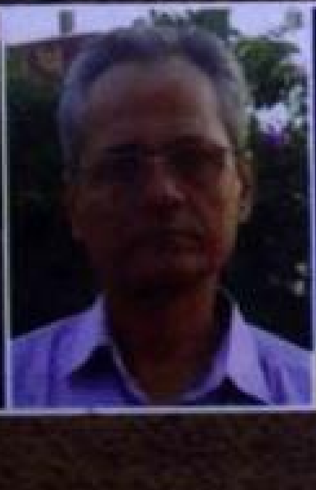
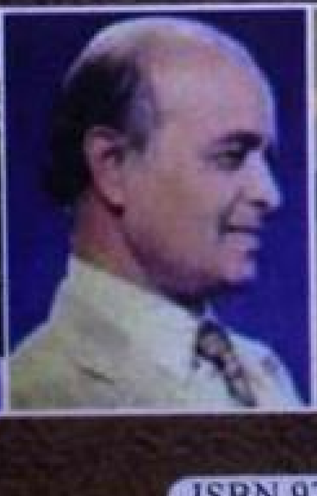
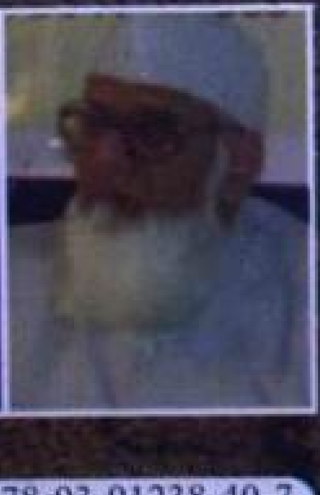
By : Suhail Anjum





ISBN 978-93-91238-40-7
978-93-91238-40-7
www.ephbooks.com

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
New Delhi , INDIA